صفر المظفر ۱۴۴۲ھ
اکتوبر ۲۰۲۰ء

ماہنامہ میثاق (لاہور)

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

یزید کی ولی عہدی اور سانحۂ کربلا
کا تاریخی پس منظر
فلسفۂ انقلاب کی روشنی میں
بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

داعی رجوع الی القرآن بانیٔ تنظیم اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن
ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول — سُورۃ الفاتحہ وسُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن
صفحات: 360، قیمت 500 روپے

حصہ دوم — سُورۃ آل عمران تا سُورۃ المائدہ
صفحات 326، قیمت 500 روپے

حصہ سوم — سُورۃ الانعام تا سُورۃ التوبہ
صفحات 331، قیمت 500 روپے

حصہ چہارم — سُورۃ یُونس تا سُورۃ الکہف
صفحات 394، قیمت 550 روپے

حصہ پنجم — سُورۃُ مریَم تا سُورۃُ السَّجدۃ
صفحات 480، قیمت 750 روپے

حصہ ششم — سُورۃُ الاحزاب تا سُورۃُ الحجرات
صفحات 484، قیمت 750 روپے

حصہ ہفتم — سُورۃُ قٓ تا سُورۃُ النَّاس
صفحات 560، قیمت 800 روپے

(مکمل سیٹ: 4300 روپے)

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون (042)35869501-3

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 69

شمارہ : 10

صفر المظفر 1442ھ

اکتوبر 2020ء

فی شمارہ -/40

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

- اندرون ملک 400 روپے
- بھارت و بنگلہ دیش 900 روپے
- ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 1200 روپے
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700، فون: 3-35869501

فیکس: 35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org

رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321

publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: ”دارالاسلام“ ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 79-35473375 (042)

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال —— 5

جنسی تشدد کے بڑھتے ہوئے واقعات: ذمہ دار کون؟ — ادارہ

بیانُ القُرآن —— 9

سورۃ الفتح (آیات ۱ تا ۱۷) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تذکرہ و تبصرہ —— 28

یزید کی ولی عہدی اور سانحۂ کربلا کا تاریخی پس منظر — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

جادہ و منزل —— 45

قرآن مجید سے زندہ تعلق: ماضی، حال، مستقبل — حافظ شفیق احمد

دعوت و عزیمت —— 59

انسانی تاریخ میں اقامتِ دین کا تسلسل (۷)
آنے والا غلبۂ اسلام کا دور — انجینئر محمد رشید عمر

دردِ دلِ مُسلم.... —— 81

علّامہ اقبال اور عشقِ مصطفیٰ ﷺ — ارسلان اللہ خان

انوارِ ہدایت —— 92

خدمتِ خلق اور سیرتُ النّبی ﷺ — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

جنسی تشدّد کے بڑھتے ہوئے واقعات:

ذِمّہ دار کون؟

موٹروے پر انسانیت کو شرما دینے والا واقعہ‘ جس میں ایک خاتون کو گاڑی سے اُتار کر اُس کے بچّوں کے سامنے زیادتی کا نشانہ بنایا گیا‘ انتہائی ہولناک سانحہ ہے‘ جس سے ہمارے معاشرے کا اصل چہرہ دنیا کے سامنے آ گیا ہے۔ بجائے اس کے کہ ہمارے سر شرم سے جھک جاتے‘ ہر کوئی اپنے مفاد اور اپنی مرضی سے اس کو مختلف رنگ دینے میں مصروف ہے اور ذِمّہ داران کے خلاف اب تک کوئی کارروائی عمل میں نہیں لائی گئی۔ کہنے کو تو کچھ ملزمان بھی پکڑے گئے ہیں‘ اگرچہ مرکزی ملزم عابد ابھی تک فرار ہے‘ لیکن ہمارے بوسیدہ عدالتی نظام میں اصل مجرموں تک قانون کے ہاتھ کب پہنچتے ہیں اور انہیں قرار واقعی سزا کب ملتی ہے‘ یہ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ اس لیے کہ اس نظام میں اگر مجرموں کو واقعی سزا مل رہی ہوتی تو آج اس طرح کے واقعات نہ ہو رہے ہوتے۔ مجرموں کو سزا نہ ملنے اور قانون پر عمل درآمد نہ ہونے کی وجہ سے ہی ایسے جرائم میں آئے روز اضافہ ہو رہا ہے۔

موٹروے سانحہ کے بعد سے لے کر اب تک ملک بھر میں درجنوں کیس رپورٹ ہو چکے ہیں جن میں خواتین اور بچوں کو زیادتی کا نشانہ بنایا گیا۔ ان کی تفصیلات بیان کرنے کے لیے کئی صفحات درکار ہوں گے۔ سوشل میڈیا اور اخبارات کی زینت بننے والے ان واقعات سے ہر کوئی اندازہ لگا سکتا ہے کہ ان میں ایک سے بڑھ ایک ہولناک واقعہ ہے کہ جس کو دیکھ کر شیطان بھی شرما جائے۔ لیکن دوسری طرف انصاف کے حصول اور قانون پر عمل درآمد کی صورتِ حال کس قدر سنگین ہے اس کا اندازہ ان تازہ واقعات میں سے ہر ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ بہاولپور میں زیادتی کی شکار لڑکی نے انصاف نہ ملنے پر خودکشی کر لی اور خودکشی سے قبل انصاف

کے لیے دھکے کھاتے والد کے لیے پیغام چھوڑا: ’’ابّا! تم کل سر اُٹھا کر جیو گے‘‘۔ اسی طرح ایک خبر کے مطابق گوجرانوالہ میں ایک تنازع کے دوران لڑکی نے ۱۵ پر کال کی تو مدد کے لیے آنے والے پولیس آفیسر نے گھر کے اندر اس لڑکی کو زیادتی کا نشانہ بنا ڈالا۔

ایسے ہولناک واقعات کسی بھی منظّم معاشرے اور باوقار قوم کے اندر اس قدر تسلسل اور بے رحمانہ انداز میں ہرگز نہیں ہو سکتے۔ ایسا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب کوئی معاشرہ ہر اصول‘ ضابطے اور اقدار و روایات سے محروم ہو کر گل سڑ جائے‘ جہاں کوئی قاعدہ قانون نہ ہو اور نہ ہی کوئی مجرموں کو پوچھنے والا ہو۔ بحیثیت قوم اور معاشرہ ہمارا بھی یہی وطیرہ بن چکا ہے کہ ہم ہر ایسے کیس یا ہولناک واقعات کے بعد چند روز تک خوب شور شرابا کرتے ہیں‘ حکومتی اور ریاستی عہدیداروں کے بیانات کی بھرمار بھی سامنے آتی ہے‘ عوام بھی چند روز تک خوب چیختے چلّاتے ہیں۔ خاص طور پر ہمارا میڈیا تو ایسی ہاہا کار مچاتا ہے کہ جیسے ابھی آسمان سر پر گرا لے گا۔ لیکن اس کے بعد نہ تو حکومتی اور ریاستی اداروں اور ذِمّہ داران کی طرف سے ایسے واقعات کی روک تھام کے لیے کوئی عملی اقدام سامنے آتا ہے اور نہ ہی عوام کو اس تقاضے کا احساس رہتا ہے کہ ایسے واقعات کے خلاف سڑکوں پر نکلیں‘ اور جب تک حکومتِ وقت ایسے واقعات کی روک تھام کے حوالے سے کوئی باقاعدہ قانونی اور آئینی اقدام نہ اُٹھائے اس وقت تک عوام اس قومی فریضے سے پیچھے نہ ہٹیں‘ تاکہ آئندہ کسی کی بیٹی‘ کسی کی ماں‘ کسی کی بہن یا کسی کے بچوں کے ساتھ ایسا ظلم اور ایسی زیادتی نہ ہو۔

لیکن نہ تو ہمارے حکومتی ادارے ایسے کسی عملی اقدام کے حوالے سے مخلص ہیں اور نہ ہی عوام اپنے معاشرے کے سدھار کے لیے اتنے سنجیدہ ہیں کہ وہ اس کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے اپنی ملی اور قومی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے بارے میں سوچ سکیں۔ بجائے اس کے ہر کوئی اپنی اپنی جگہ معاشرتی بگاڑ اور قومی اقدار کے زوال کا سبب ہے۔ بحیثیت فرد‘ قوم‘ ملّت‘ حکومت‘ ریاست‘ کوئی بھی اپنی ذِمّہ داری پوری نہیں کر رہا۔ جو میڈیا ایسے واقعات پر آسمان سر پر اُٹھا لیتا ہے وہی میڈیا ایسے واقعات کا سب سے بڑا ذمہ دار بھی ہے۔ ہمارے معاشرے میں جس قدر فحاشی‘ عریانی اور بے راہروی پھیل رہی یہ سب میڈیا کا ہی کیا دھرا ہے۔ ٹی وی ڈراموں‘ فلموں‘ اشتہارات اور اخبارات میں ہر جگہ میڈیا جنسی اشتعال انگیزی پھیلانے میں اوّلین کردار ادا کر رہا ہے۔ خاص طور پر سوشل میڈیا نے جو تباہی پھیلائی ہے اس کے اثرات سے بچنا تو اب

کسی بھی فرد یا گھر کے لیے ممکن نہیں رہا۔ لیکن اس تباہی کو روکنے میں نہ تو حکومتی ادارے کوئی کردار ادا کر رہے ہیں اور نہ ہی عوام الناس خصوصاً والدین اس حوالے سے کسی قاعدے ضابطے یا احتیاطی تدابیر اختیار کرنے میں سنجیدہ ہیں۔ خاص طور پر یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ سوشل میڈیا کو کنٹرول کرنے کے حوالے سے اقدامات کرے اور دوسری طرف پیمرا کے ذریعے ٹی وی چینلز‘ اخبارات اور فلم و تھیٹر کو راہِ راست پر لائے اور اس حوالے سے باقاعدہ قانون اور قاعدے بنائے۔ لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا‘ بحیثیت قوم اور معاشرہ ہم اتنے گل سڑ چکے ہیں کہ اب ہمیں اپنی تباہی و بربادی کا احساس تک نہیں ہوتا ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا!

ہماری حکومتیں بین الاقوامی اداروں اور این جی اوز کی جکڑ بندیوں میں اس قدر پابند ہیں کہ وہ اپنی مرضی سے کوئی قانون تک نہیں بنا سکتیں۔ ہماری سیاسی جماعتیں اور سیاسی لیڈر محض اپنے سیاسی مفادات کے تحت ان بین الاقوامی اداروں اور این جی اوز کو خوش کرنے کے ایجنڈے پر رواں دواں ہیں۔ چنانچہ آئے روز ایسے واقعات پر ہماری حکومتوں اور سیاسی لیڈروں کے بیانات محض بیانات کی حد تک محدود رہتے ہیں‘ جبکہ ان واقعات کی روک تھام کے لیے وہ قومی و ملّی مفاد میں کوئی قدم اُٹھانے سے قاصر رہتے ہیں۔

جہاں تک ہماری مذہبی اور دینی جماعتوں کا تعلق ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ ایسے واقعات پر غم و غُصّہ کا اظہار کرنے کے علاوہ پریس ریلیز جاری کرنے تک محدود رہتی ہیں۔ خاص طور پر ہماری دینی سیاسی جماعتیں تو سیاسی مفادات کے لیے ملین مارچ کرتی ہیں اور ہر سیاسی داؤ پیچ کھیلتی ہیں‘ لیکن معاشرے میں اسلام کے نفاذ اور غلبے کے لیے کوئی تحریک‘ کوئی ملین مارچ کرنا شاید ان کے ایجنڈے میں شامل ہی نہیں ہے۔ اگرچہ بظاہر ہماری حکومت بھی ریاستِ مدینہ کے دعوے کرتی ہے اور ہماری دینی سیاسی جماعتیں بھی نفاذِ اسلام کے نعرے کو اپنے منشور کا پیش خیمہ بناتی ہیں لیکن عملی طور پر معاشرے میں نفاذِ اسلام کے لیے کوئی عملی جِدّوجُہد ان کی طرف سے آج تک سامنے نہیں آسکی۔ عملی طور پر سب کے مفادات اسی گلے سڑے نظام کے ساتھ جُڑے ہیں جس کے اندر رہتے ہوئے ایک باشعور و باوقار معاشرے کا قیام ممکن ہی نہیں ہے‘ کیونکہ جو نظام مغرب

نے بنایا ہے اس کے اندر صرف اور صرف مغربیت اور سفاکیت ہی پروان چڑھے گی۔ ایسا نظام جس میں انسانیت اپنی موت آپ مر جائے اور صرف حیوانیت باقی رہ جائے‘ جس نظام کے تحت آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت سکولوں‘ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ایسی ہو کہ ان کے اندر قدم رکھتے ہی شرم و حیا انسان سے دور ہو جائے‘ اس نظام کے تحت پروان چڑھنے والا معاشرہ کس قدر بھیانک اور غلیظ ہوگا۔

ہماری رائے میں معاشرے کا سدھار اگر ممکن ہے تو وہ صرف اور صرف اس آفاقی اور فطری نظام کے تحت ممکن ہے جو انسانیت اور فطرت کے خالق نے خود انسانوں کے لیے بنایا ہے اور وہ واحد نظام اسلام کا نظام ہے جس کے تحت پروان چڑھنے والے معاشرے کی مثالیں ساری دنیا کے سامنے موجود ہیں کہ زیورات سے لدی پھندی اکیلی عورت میلوں سفر طے کر کے ایک شہر سے دوسرے شہر جائے اور کوئی اس کی طرف میلی آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ کر سکے۔ ہم نے یہ ملک اسی نظام کے قیام کے وعدے کے ساتھ حاصل کیا تھا۔ اگر ہم اپنے وعدے پر قائم رہتے ہوئے اس فطری نظام کو پاکستان میں قائم کرنے کی ہر سطح پر عملی جدّوجُہد کرتے تو شاید آج ایسے واقعات رونما ہونے کی نوبت ہی نہ آتی اور ہم دنیا کے سامنے ایک باوقار اور معزز قوم کے طور پر سر اُٹھا کر کھڑے ہوتے۔ لیکن بدقسمتی سے ایک عام فرد سے لے کر سیاسی لیڈروں‘ سیاسی و دینی جماعتوں اور حکومتوں تک کسی نے اس حوالے سے اپنی ذمہ داری پوری نہیں کی‘ جس کا نتیجہ آج ہم اس صورت میں بھگت رہے ہیں کہ نہ ہماری جان محفوظ‘ نہ ہماری عزّت محفوظ‘ نہ مال محفوظ ہے اور نہ ہی ہمارا دین و ایمان محفوظ ہے۔ ❁❁❁

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز
ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی مقبولِ عام تالیف
مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق
اشاعت خاص: 45 روپے اشاعت عام: 30 روپے

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ الفَتح

تمہیدی کلمات

سورۃ الفتح صلح حدیبیہ کے فوراً بعد نازل ہوئی۔ غزوۂ احزاب (۵ ہجری) کے بعد رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مخاطب کر کے فرمادیا تھا: ((لَنْ تَغْزُوْكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِكُمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ)) کہ اب قریش میں تم پر چڑھائی کرنے کے لیے دم نہیں رہا' آئندہ تم لوگ ان پر چڑھائی کرو گے۔ ۶ ہجری میں حضور ﷺ نے عمرہ کرنے کا ارادہ فرمایا تو چودہ سو (بعض روایات کے مطابق ۱۸۰۰) صحابہؓ بھی آپؐ کے ساتھ عمرہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ چنانچہ آپؐ صحابہؓ کے ساتھ حالت احرام میں سفر کرتے ہوئے حدیبیہ کے مقام پر پہنچ گئے۔ آپؐ کے اس اقدام نے قریشِ مکّہ کو ایک بہت بڑے امتحان میں ڈال دیا۔ قریشِ مکّہ مسلمانوں کو عمرہ کرنے سے روک بھی نہیں سکتے تھے' کیونکہ بیت اللہ کے طواف سے کسی کو روکنا عرب روایت ہی کے خلاف تھا۔ دوسری طرف انہیں یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ مسلمان اتنی بڑی تعداد میں دندناتے ہوئے مکّہ میں داخل ہوں' پورے شہر میں آزادی سے گھومیں پھریں اور تمام قبائل میں یہ تاثر پھیلائیں کہ پچھلے اٹھارہ سال سے جاری کش مکش میں وہ جیت گئے ہیں اور قریش کو شکست ہوگئی ہے۔ چنانچہ چارو ناچار قریش نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کسی قیمت پر بھی مسلمانوں کو مکّہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے اور اپنے اس فیصلے کے بارے میں انہوں نے مسلمانوں کو باقاعدہ آگاہ کر دیا۔

ان حالات میں حضور ﷺ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو بات چیت کے لیے مکّہ بھیجا تو قریش نے ان کو مکّہ ہی میں روک لیا۔ اس دوران میں انؓ کے بارے میں یہ خبر مشہور ہوگئی کہ قریش نے انہیں شہید کر دیا ہے۔ اس پر حضور ﷺ نے صحابہؓ سے ایک خصوصی بیعت کا اہتمام

فرمایا۔ اس بیعت کے ذریعے موقع پر موجود تمام صحابہؓ نے عہد کیا کہ وہ یہاں سے واپس نہیں جائیں گے اور آپؐ کے حکم پر اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔ تاریخ میں اس بیعت کو بیت رضوان' بیعت عَلٰی اَنْ لَا نَفِرَّ یا بیعت علی الموت کا نام دیا گیا ہے۔ اس بیعت کے وقت آپ ﷺ ایک درخت کے نیچے تشریف فرما تھے' اس لیے اسے ''بیعت الشجرہ'' بھی کہا جاتا ہے۔ جب اس بیعت کی خبر مکّہ پہنچی تو قریش کو اس صورتِ حال کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا پڑا۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ مسلمانوں میں کوئی ایک فرد بھی پیچھے ہٹنے والا نہیں ہے اور یہ بھی کہ جب یہ لوگ کوئی عہد کرتے ہیں تو اسے ہر صورت نبھاتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے حالات کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے مذاکرات کے لیے سفارتی کوششیں تیز کر دیں۔ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھی واپس بھیج دیا اور قریش کی طرف سے سہیل بن عمرو کی قیادت میں ایک وفد بھی صلح کی بات چیت کرنے کے لیے حضور ﷺ کے کیمپ میں پہنچ گیا۔ یہ مذاکرات بالآخر صلح پر منتج ہوئے جسے تاریخ میں ''صلح حدیبیہ'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

اس صلح نامہ کی اوّلین شرط یہ تھی کہ دس سال تک فریقین کے درمیان جنگ بند رہے گی۔ دوسرے یہ کہ قبائل عرب میں سے جو قبیلہ بھی فریقین میں سے کسی ایک کا حلیف بن کر اس معاہدے میں شامل ہونا چاہے گا اُسے اس کا اختیار ہوگا۔ تیسرے یہ کہ محمد ﷺ اور آپؐ کے ساتھی اس وقت عمرہ ادا کیے بغیر واپس چلے جائیں گے اور آئندہ سال وہ عمرے کے لیے آ کر تین دن تک مکّہ میں ٹھہر سکتے ہیں' بشرطیکہ پُرتلوں میں ایک ایک تلوار کے سوا کوئی سامانِ حرب ساتھ نہ لائیں۔ ان تین دنوں کے لیے اہلِ مکّہ شہر خالی کر دیں گے۔ مگر واپس جاتے ہوئے وہ یہاں سے کسی شخص کو اپنے ساتھ لے جانے کے مجاز نہ ہوں گے۔

بظاہر اس صلح کی شرائط بہت غیر متوازن تھیں۔ ان شرائط سے یوں لگتا تھا جیسے مسلمانوں کو جھک کر صلح کرنی پڑی ہے' بلکہ بعض شرائط سے تو مسلمانوں کی سبکی کا تاثر بھی ملتا تھا۔ مثلاً ایک شرط یہ تھی کہ اگر کوئی مسلمان مدینہ سے مکّہ آ جائے تو قریش اسے واپس نہیں کریں گے' لیکن اگر کوئی مسلمان مکّہ سے مدینہ چلا جائے تو مسلمانوں کو اسے واپس کرنا ہوگا۔ اتفاق سے اسی شرط کے حوالے سے عین موقع پر مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑی آزمائش بھی آن پڑی۔ ہوا یوں کہ جونہی صلح نامہ کی تحریر مکمل ہوئی تو ایک مسلمان نوجوان ابوجندل رضی اللہ عنہ قریش کی قید سے فرار ہو کر

مسلمانوں کے کیمپ میں آ پہنچے۔ حضرت ابوجندل ؓ سہیل بن عمرو کے بیٹے تھے جو مذاکرات کے لیے قریش کا سفیر تھا اور اس وقت تک مسلمانوں کے کیمپ ہی میں موجود تھا۔ اس نے معاہدے کے مطابق اپنے بیٹے کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ متعلقہ شرط کے مطابق مسلمان حضرت ابوجندلؓ کو واپس کرنے کے پابند تھے۔ ادھر ابوجندلؓ دہائی دے رہے تھے کہ انہیں دوبارہ ان قصائیوں کے حوالے نہ کیا جائے۔ ادھر چونکہ معاہدے کی شرائط طے ہو چکی تھیں اس لیے حضور ﷺ نے ابوجندلؓ کو واپس بھیجنے کا فیصلہ فرمایا۔ آپؐ نے فرمایا: ''ابوجندل! تم صبر کرو، ہم معاہدہ کر چکے ہیں اور ہم پر معاہدے کی پابندی لازم ہے''۔ چنانچہ حضور ﷺ کے حکم پر حضرت ابوجندلؓ کو سہیل بن عمرو کے سپرد کر دیا گیا۔ اس وقت مسلمانوں کی صفوں میں ایسی رقّت آمیز صورتِ حال پیدا ہوگئی جسے برداشت کرنا ان کے لیے آسان نہیں تھا۔ مسلمانوں کا پورا لشکر مضطرب تھا۔ کوئی شخص بھی اُن مصلحتوں کو نہیں سمجھ رہا تھا جنہیں نگاہ میں رکھ کر نبی اکرم ﷺ یہ شرائط قبول فرما رہے تھے۔ اسی جذباتی کیفیت میں حضرت عمر ؓ رسول اللہ ﷺ سے وہ مکالمہ بھی کر بیٹھے جس کا انہیں ساری عمر شدید رنج رہا۔ حضرت عمرؓ نے حضورؐ سے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ! کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ حضورؐ نے جواب دیا: ہاں ہم حق پر ہیں۔ حضرت عمرؓ نے پھر پوچھا: کیا آپؐ اللہ کے رسول نہیں ہیں؟ آپؐ نے مسکرا کر جواب دیا: ہاں میں اللہ کا رسولؐ ہوں۔ حضرت عمرؓ نے پھر پوچھا کہ ہم اس قدر دب کر کیوں صلح کر رہے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ میں وہی کر رہا ہوں جس کا مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔

اسی طرح کا واقعہ اس دوران حضرت علی ؓ کے ساتھ بھی پیش آیا۔ حضرت علی ؓ صلح نامہ لکھ رہے تھے، جبکہ حضور ﷺ املا کروا رہے تھے۔ جب حضورؐ نے یہ فقرہ لکھوایا کہ یہ ''صلح نامہ محمدؐ رسول اللہ (ﷺ) اور قریشِ مکّہ کے مابین طے پایا ہے'' تو اس پر سہیل بن عمرو نے اعتراض کر دیا کہ ہم چونکہ آپ کو اللہ کا رسول نہیں مانتے اس لیے آپؐ ''رسول اللہ'' کے الفاظ عبارت سے حذف کرا دیں۔ حضور ﷺ نے مسکرا کر فرمایا کہ تم مانو یا نہ مانو، میں اللہ کا رسول ہوں اور ساتھ ہی آپؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ ''رسول اللہ'' کے الفاظ حذف کر کے عبارت یوں لکھی جائے کہ یہ صلح نامہ محمد بن عبداللہ اور قریش کے مابین طے پایا ہے۔ اس پر حضرت علیؓ نے عرض کیا کہ آپؐ کے نام کے ساتھ لکھے ہوئے ان الفاظ کو میں اپنے ہاتھ سے نہیں مٹا سکتا۔

اس پر حضور ﷺ نے ''رسول اللہ'' کے الفاظ کو خود اپنے ہاتھوں سے حذف کر کے معاہدے کی عبارت مکمل کرائی۔ اگرچہ حضرت عمر اور حضرت علی ؓ کا مذکورہ طرزِ عمل غیرتِ حق اور حمیّتِ دینی کا مظہر تھا، لیکن ایسے مواقع کے لیے عام قاعدہ یہی ہے کہ ''اَلْاَمْرُ فَوْقَ الْاَدَب''، یعنی حکم کو ادب پر ترجیح دی جائے۔

صلح نامہ پر فریقین کے دستخط ہو جانے کے بعد حضور ﷺ نے اسی جگہ پر احرام کھولنے اور قربانی کے جانور ذبح کرنے کا حکم دیا۔ حضور ﷺ کے اتباع میں اگرچہ سب نے احرام بھی کھول دیے اور قربانی کے جانور بھی ذبح کر دیے لیکن عملی طور پر اس وقت ہر مسلمان دل گرفتہ اور شدتِ غم سے نڈھال تھا۔ یہ وہ صورت حال تھی جس میں یہ سورت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی دلجوئی کے لیے خصوصی طور پر اس کے آغاز میں ایک بہت بڑی خوشخبری کا اعلان فرمایا: ﴿ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝۱ ﴾ یعنی اے مسلمانو! تم لوگ تو سمجھ رہے ہو کہ تمہیں بہت دب کر صلح کرنی پڑی ہے لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس صلح نامہ کے پردے میں ہم نے اپنے رسول ﷺ کو ایک عظیم الشان فتح عطا فرمائی ہے۔ بعد میں آنے والے حالات سے ثابت بھی ہو گیا کہ صلح حدیبیہ مسلمانوں کے لیے واقعی فتح مبین تھی۔ بہرحال اس میں سب سے بڑی کامیابی تو یہی تھی کہ قریشِ مکّہ نے مسلمانوں سے معاہدہ کر کے انہیں اپنے برابر کا ایک فریق تسلیم کر لیا تھا۔

آیات ۱ تا ۱۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝۱ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَ يَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝۲ وَّ يَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ۝۳ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ؕ وَ لِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝۴ لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ

تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ يُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ
عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا ۙ﴿۵﴾ وَّ يُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ
وَالْمُشْرِكِيْنَ وَ الْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ؕ عَلَيْهِمْ
دَآئِرَةُ السَّوْءِ ۚ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ لَعَنَهُمْ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ؕ
وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۶﴾ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ
اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۷﴾ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّ
نَذِيْرًا ۙ﴿۸﴾ لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَ تُوَقِّرُوْهُ ؕ وَ
تُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ
اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى
نَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۰﴾

آیت ۱ ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ﴿۱﴾﴾ ’’یقیناً ہم نے آپؐ کو ایک بڑی روشن فتح عطا فرمائی ہے۔‘‘

آیت ۲ ﴿لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ﴾ ’’تاکہ اللہ بخش دے آپ کی کوئی کوتاہیاں جو پیچھے ہوئیں اور جو بعد میں ہوئیں‘‘

رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے لفظ ’’ذنب‘‘ کی وضاحت کے لیے سورۂ محمد (ﷺ) کی آیت ۱۹ کی تشریح ملاحظہ ہو۔ یہاں بھی ذَنْۢبِكَ (آپ کی کوتاہیوں) سے مراد وہ خامیاں اور کوتاہیاں ہیں جو غلبۂ اسلام کی اس جدّوجُہد میں رہ گئی تھیں جو رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں مسلمان کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان ساری کمزوریوں اور کوتاہیوں سے درگزر کر کے محض اپنے فضل سے ان کی تلافی کر دی ہے اور آپؐ کے لیے فتح و نصرت کا دروازہ کھول دیا ہے۔

﴿وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۲﴾﴾ ’’اور تاکہ اللہ اپنی نعمت کا اتمام فرما دے آپؐ پر اور آپؐ کی راہنمائی کرے سیدھے راستے کی طرف۔‘‘

بظاہر اس فقرے سے بھی لفظ ’’ذنب‘‘ کی طرح اشکال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ تو پہلے ہی سیدھی راہ پر تھے بلکہ ﴿وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۲﴾﴾ (الشوریٰ) کا

مصداق تھے‘ اور آپؐ کے تمام اہلِ ایمان ساتھی بھی پچھلے اٹھارہ برسوں سے سربکف ہو کر اسی راہِ ہدایت پر گامزن تھے تو پھر یہاں ﴿وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۙ﴾ کے فرمان کا کیا مفہوم ہے؟ اس بارے میں مفسّرین کی بہت سی آراء ہیں‘ جن کی تفصیل بیان کرنا یہاں ممکن نہیں۔ بہرحال میرے نزدیک اس کی توجیہہ وہی ہے جو میں قبل ازیں سورۂ محمد کی آیت ۱۹ کے ضمن میں لفظ ’’ذنب‘‘ کی وضاحت کے حوالے سے بیان کر چکا ہوں کہ اے نبی ﷺ! آپ اپنے اہلِ ایمان ساتھیوں کے ساتھ اقامتِ دین کے لیے جو مسلسل جدّوجُہد کر رہے ہیں‘ اس حوالے سے اگر اہلِ ایمان میں سے کسی سے اب تک کسی قسم کی کوئی کوتاہی ہوئی ہے تو اللہ تعالیٰ اس فتح مبین کی برکت سے ایسی تمام کوتاہیوں کی تلافی فرما دے گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم کرنے کے لیے آپ لوگوں کی یہ جدّوجُہد تیر کی طرح سیدھی اپنے ہدف کی طرف تیزی سے بڑھے گی اور ’’اظہارِ دینِ حق‘‘ کا عملی مظاہرہ اب بہت جلد دنیا کی نظروں کے سامنے آ جائے گا۔ گویا اس مقام پر آپ ﷺ کو سیدھا راستہ دکھانے کا مطلب فتح و کامرانی کا راستہ دکھانا ہے۔

جہاں تک آیت زیر مطالعہ میں ’’اتمامِ نعمت‘‘ کے وعدے کا تعلق ہے تو اس سے مراد دراصل دین کا اتمام ہی ہے جس کے بارے میں یہ خوشخبری ہم سورۃ المائدۃ کی آیت ۳ میں پڑھ آئے ہیں: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ﴾ ’’آج کے دن مَیں نے تمہارے لیے تمہارے دین کی تکمیل فرما دی ہے‘ اور تم پر اپنی نعمت کا اتمام فرما دیا ہے‘ اور تمہارے لیے مَیں نے اسلام کو بحیثیت دین کے پسند کر لیا ہے‘‘۔ البتہ اس اہم مضمون کے درست ادراک کے لیے ضروری ہے کہ دین کے اتمام کی دونوں صورتیں پیش نظر رہیں۔ اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ قرآن حکیم میں تمام احکامِ دین بیان کر دیے گئے اور شریعت مکمل ہو گئی۔ لیکن دین اسلام چونکہ ایک ضابطہ حیات ہے اس لیے عملی طور پر اس کی تکمیل تب ہی ممکن تھی جب اس کے تحت باقاعدہ ایک حکومت قائم ہوتی اور معاشرے کے اندر اس کے تمام قوانین کی تنفیذ کا مظاہرہ اور نمونہ عملی طور پر سامنے آتا۔ اسی کیفیت کا نام دراصل ’’اظہارِ دین‘‘ ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں تین مقامات (التوبۃ:۳۳‘ الفتح:۲۸‘ اور الصف:۹) پر ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ کے الفاظ میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے ’’مقصد‘‘ کے طور پر بیان ہوا ہے۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ میں یہاں خصوصی طور پر اسی ’’نعمت‘‘ کے اتمام کی طرف اشارہ ہے کہ اے نبی ﷺ! آپ کے ساتھیوں

کی اگلی پچھلی کوتاہیوں کی تلافی کے لیے ہم نے آپؐ کو یہ ''فتح مبین'' عطا کر دی ہے۔ اب آپؐ کی جِدّوجُہد تیزی کے ساتھ اپنے ہدف کی طرف بڑھے گی اور جزیرہ نمائے عرب میں بہت جلد ''اظہارِ دینِ حق'' کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے آجائے گا۔

آیت ۳ ﴿وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ۝۳﴾ ''اور اللہ آپ کی مدد کرے گا' بہت زبردست مدد۔''

اب آپؐ کی جِدّوجُہد میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی مدد شامل ہوگی جسے کوئی شکست نہیں دے سکے گا۔

آیت ۴ ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ؕ﴾ ''وہی ہے جس نے اہلِ ایمان کے دلوں میں سکینت نازل کر دی تاکہ وہ اضافہ کر لیں اپنے ایمان میں مزید ایمان کا۔''

یہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ سکینت اور طمانیت ہی تھی جس کے باعث صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنی جانیں قربان کر دینے کے فیصلے پر پورے سکونِ قلب کے ساتھ جازم رہے۔ پھر اسی سکینت کے سہارے صحابہ کرامؓ اس کڑے امتحان سے بھی سرخرو ہو کر نکلے جو اس خاص موقع پر انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کے حوالے سے درپیش تھا۔ اس موقع پر اصل صورتِ حال یہ تھی کہ صحابہؓ میں سے کوئی ایک فرد بھی صلح کے حق میں نہیں تھا' لیکن اس کے باوجود اس دوران ان کے نظم وضبط کا یہ عالَم رہا کہ بغیر کسی ایک استثناء کے پوری جماعت نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر سرِ تسلیم خم کر دیا۔

بادیٔ النظر میں یہ کہنا ذرا عجیب لگتا ہے کہ ''صحابہؓ میں سے کوئی بھی صلح کے حق میں نہیں تھا'' لیکن تاریخی حقائق بہرحال ایسی ہی صورتِ حال کی گواہی دیتے ہیں۔ چنانچہ سیرت کی کتابوں میں ایسی روایات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صلح نامہ پر دستخط ہو جانے کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمانو! اب اٹھو' احرام کھول دو اور یہیں پر قربانیاں کر دو' تو آپؐ کے کہنے پر کوئی ایک مسلمان بھی نہ اٹھا۔ آپؐ نے اپنا یہ حکم پھر دہرایا تو پھر بھی کوئی نہ اٹھا۔ حتیٰ کہ آپؐ نے تیسری مرتبہ فرمایا کہ لوگو اٹھو! احرام کھول دو اور قربانی کے جانور ذبح کر دو' تو آپؐ کے تیسری مرتبہ فرمانے پر بھی کوئی تعمیل کے لیے نہ اٹھا۔ بلاشبہ صحابہؓ کا یہ ''توقف'' اضطراری کیفیت کے باعث تھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ان کے لیے امتحان کی کوئی صورت ہے' اس کے بعد شاید کوئی

نیا حکم آجائے گا اور صورت حال بدل جائے گی۔ دراصل یہ صورتِ حال صحابہؓ کی سمجھ سے باہر تھی کہ جو احرام انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اقتدا میں عمرے کے لیے باندھے ہیں وہ عمرہ ادا کیے بغیر میدانِ حدیبیہ میں ہی کھول دیے جائیں۔ بہرحال حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تیسری مرتبہ حکم دینے پر بھی جب کوئی احرام کھولنے کے لیے نہ اٹھا تو آپؐ دل گرفتہ ہو کر اپنے خیمے میں تشریف لے گئے۔ اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا آپؐ کے ساتھ تھیں۔ جب آپؐ نے تمام صورت حال انہیں بتائی تو انہوں نے مشورہ دیا کہ آپؐ اپنی زبان مبارک سے کچھ نہ فرمائیں' بس آپؐ اپنا احرام کھول دیں اور قربانی کا جانور ذبح کر دیں۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احرام کھولنے اور جانور ذبح کرنے پر سب مسلمانوں نے احرام کھول دیے اور اپنے اپنے جانور ذبح کر دیے۔ صحابہؓ کے مذکورہ ردِعمل سے یہ حقیقت بہرحال عیاں ہوتی ہے کہ اس موقع پر وہ سب کے سب ''صلح'' کو خوش آمدید کہنے کے بجائے اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے زیادہ پُرعزم تھے۔

﴿وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝۴﴾ ''اور آسمانوں اور زمین کے تمام لشکر تو اللہ ہی کے ہیں۔ اور اللہ سب کچھ جاننے والا' کمال حکمت والا ہے۔''

آیت ۵ ﴿لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ؕ﴾ ''تاکہ وہ داخل کرے اہلِ ایمان مَردوں اور عورتوں کو اُن باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی' جن میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے' اور دور کر دے ان سے ان کی برائیوں کو۔''

﴿وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝۵﴾ ''اور یہی ہے اللہ کے نزدیک بڑی کامیابی۔''

آیت ۶ ﴿وَّيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ؕ﴾ ''اور (تاکہ) اللہ سزا دے منافق مَردوں اور منافق عورتوں کو اور مشرک مَردوں اور مشرک عورتوں کو جو اللہ کے بارے میں بہت بُرے گمان رکھنے والے ہیں۔''

یہ الفاظ سورۃ الاحزاب کی آخری آیت کے الفاظ سے گہری مشابہت رکھتے ہیں۔ اس کی

ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ دونوں سورتیں ایک ہی زمانہ میں نازل ہوئی ہیں۔ سورۃ الاحزاب ۵ ہجری میں نازل ہوئی تھی جبکہ سورۃ الفتح ۶ ہجری میں۔

﴿عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ۚ﴾ ’’انہی پر مسلّط ہے برائی کا دائرہ۔‘‘

یعنی برائی کے پھیر میں وہ خود ہی آ گئے ہیں۔

﴿وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝۶﴾

’’اور اللہ ان پر غضبناک ہوا ہے اور اُس نے ان پر لعنت فرمائی ہے اور ان کے لیے جہنّم تیار کر رکھی ہے۔ اور وہ بہت بری جگہ ہے لوٹنے کی۔‘‘

آیت ۷ ﴿وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝۷﴾ ’’اور آسمانوں اور زمین کے لشکر کُل کے کُل اللہ ہی کے اختیار میں ہیں۔ اور اللہ زبردست ہے‘ کمال حکمت والا۔‘‘

آیت ۴ کے آخر پر بھی ہو بہو یہی الفاظ آئے ہیں۔ صرف یہ فرق ہے کہ آیت ۴ کا اختتام ’’علیمًا حکیمًا‘‘ پر ہوتا ہے‘ جبکہ یہ آیت ’’عزیزًا حکیمًا‘‘ پر ختم ہو رہی ہے۔

آیت ۸ ﴿اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝۸﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کو بھیجا ہے گواہی دینے والا‘ بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر۔‘‘

یعنی محمد رسول اللہ ﷺ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی عدالت میں استغاثہ کے گواہ (prosecution witness) کے طور پر پیش ہو کر گواہی دیں گے کہ اے اللہ! تیرا دین جو مجھ تک پہنچا تھا میں نے وہ اپنی اُمّت کے لوگوں تک پہنچا دیا تھا‘ اب یہ لوگ اس کے بارے میں خود جوابدہ ہیں۔ اس عدالت اور اس میں ہونے والی گواہیوں کا نقشہ سورۃ النساء میں اس طرح کھینچا گیا ہے: ﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۝۴۱﴾ ’’تو اس دن کیا صورت حال ہوگی جب ہم ہر اُمّت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور (اے نبی ﷺ!) آپ کو لائیں گے ان پر گواہ بنا کر!‘‘

آیت ۹ ﴿لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ ؕ﴾ ’’تاکہ (اے مسلمانو!) تم ایمان رکھو اللہ اور اُس کے رسول پر اور رسول کی مدد کرو اور اُس کی تعظیم کرو۔‘‘

﴿وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝۹﴾ ’’اور تاکہ تم اللہ کی تسبیح کرو صبح و شام۔‘‘

اس آیت کے پہلے حصے میں ایمان کے حوالے سے اللہ اور اُس کے رسول کا ذکر ہے‘ اس کے بعد دوسرے فقرے ﴿وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ ؕ﴾ میں ہٗ کی دونوں ضمیریں ’’رسول ﷺ‘‘ کے لیے ہیں‘ اور اس کے بعد وَتُسَبِّحُوْهُ میں ہٗ کی ضمیر اللہ کے لیے ہے۔

آیت ۱۰ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) یقیناً وہ لوگ جو آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ حقیقت میں اللہ سے بیعت کر رہے ہیں۔‘‘

﴿يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ﴾ ’’ان کے ہاتھوں کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہے۔‘‘

اس بیعت کے اندر گویا تین ہاتھ تھے۔ رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ‘ بیعت کرنے والے شخص کا ہاتھ اور اللہ کا ہاتھ۔

﴿فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ۚ﴾ ’’تو اب جو کوئی اس کو توڑے گا تو اس کے توڑنے کا وبال اپنے اوپر ہی لے گا۔‘‘

﴿وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝۱۰﴾ ’’اور جو کوئی پورا کرے گا اس معاہدے کو جو وہ اللہ سے کر رہا ہے تو وہ اسے اجرِ عظیم عطا فرمائے گا۔‘‘

اس آیت کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے سورۃ التوبہ کی اس آیت کو ایک مرتبہ پھر سے دہرا لیں: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۟ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ﴾ (آیت ۱۱۱) ’’یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں اہلِ ایمان سے ان کی جانیں بھی اور ان کے مال بھی اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنّت ہے۔ وہ جنگ کرتے ہیں اللہ کی راہ میں‘ پھر قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں‘ یہ وعدہ اللہ کے ذمّے ہے سچّا تورات‘ انجیل اور قرآن میں۔ اور اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کو وفا کرنے والا کون ہے؟ پس خوشیاں مناؤ اُس بیع پر جس کا سودا تم نے اُس کے ساتھ کیا ہے‘‘۔ اب ان دونوں آیات کے باہمی ربط و تعلق کو اس طرح سمجھیں کہ سورۃ التوبہ کی اس آیت میں ایک ’’بیع‘‘ (سودے) کی ترغیب دی گئی ہے جبکہ زیر مطالعہ آیت میں اس بیع کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ سورۃ التوبہ کی مذکورہ بالا آیت میں بھی ب ی ع مادہ سے باب مفاعلہ ﴿بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ﴾ آیا ہے اور یہاں آیت زیر مطالعہ میں بھی ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ

﴿اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ ؕ﴾ لفظ بیعت دراصل بیع سے ہی مشتق ہے۔ عربوں کے ہاں رواج تھا کہ دو فریق جب خرید و فروخت (بیع) کا کوئی معاملہ کرتے تو سودا پکا ہو جانے پر آپس میں مصافحہ کرتے تھے۔ یہ مصافحہ دراصل ''بیع'' طے ہو جانے کا اعلان سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے ایسے مصافحے کو ''بیعت'' کا نام دے دیا گیا۔

سورۃ التوبہ کی مذکورہ بالا آیت میں اللہ اور بندے کے مابین ہونے والی بیع و شراء میں بندے کی مجبوری یہ ہے کہ وہ اس سودے کی بیعت براہِ راست اللہ کے ہاتھ پر نہیں کر سکتا۔ اس لیے اسے یہ ''بیعت'' اللہ کے کسی نمائندے یعنی کسی انسان کے ہاتھ پر ہی کرنی پڑے گی اور اس طرح عملی طور پر اس سودے یا بیع میں تین فریق شامل ہوں گے' یعنی اللہ' سودا کرنے والا شخص اور وہ شخص جس کے ہاتھ پر اس سودے کی بیعت ہوگی۔ آج بالفرض اگر میں اپنا مال و جان اللہ کی راہ میں قربان کرنے کا فیصلہ کرتا ہوں تو میرے اور اللہ کے درمیان چونکہ غیب کا پردہ حائل ہے اس لیے مجھے یہ معلوم کرنے کے لیے کوئی ''انسان'' ہی ڈھونڈنا پڑے گا کہ میں اپنی جان کب اور کیسے قربان کروں؟ اور اپنا مال کس طریقے سے کہاں خرچ کروں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ ''انسان'' اللہ کے رسول ﷺ کی شکل میں میسر تھا' انہوں نے اپنے مال و جان کے سودے کی ''بیعت'' حضور ﷺ کے ہاتھ پر کر رکھی تھی۔ چنانچہ جب حضورؐ انہیں بتاتے تھے کہ اب اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ کارزار میں پہنچ جاؤ اور اب اپنے اموال حاضر کر دو تو صحابہؓ خوشی خوشی آپؐ کے ہر حکم پر لبیک کہتے تھے۔ بلکہ وہ تو منتظر رہتے تھے کہ کب حضورؐ انہیں حکم دیں اور کب انہیں اللہ کی امانت کو لوٹانے کی سعادت نصیب ہو۔

صحابہ کرامؓ کے قلوب و اذہان کی اس کیفیت کی تصویر سورۃ الاحزاب کی اس آیت میں دکھائی گئی ہے: ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَیْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّنْتَظِرُ ۫﴾ (آیت ۲۳) ''اور اہلِ ایمان میں کچھ جواں مرد لوگ وہ ہیں جنہوں نے سچا کر دکھایا وہ وعدہ جو انہوں نے اللہ سے کیا تھا' ان میں وہ بھی ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے ہیں اور ان میں کچھ وہ ہیں جو انتظار کر رہے ہیں''۔ گویا اللہ کے ساتھ مذکورہ سودے (بیع و شراء) کے بعد وہ جواں مرد اپنی جانیں اور اپنے مال اللہ کے حضور پیش کرنے کے لیے مسلسل بے تاب و بے قرار رہتے تھے۔ کسی شاعر نے اس خوبصورت مضمون کو تغزل کے رنگ میں یوں ادا کیا ہے: ؎

وبالِ دوشِ ہے سر جسمِ ناتواں پہ مگر
لگا رکھا ہے ترے خنجر و سناں کے لیے!

کہ اے محبوب! ہم تو اپنے جسمِ ناتواں پر اپنے سر کے اس ''بوجھ'' کو صرف اس لیے اٹھائے پھر رہے ہیں کہ تو جب چاہے اور جہاں چاہے بس اسی وقت وہیں پر ہم تیری راہ میں اسے قربان کر دیں۔ اب تو ہم زندہ ہی اس ''انتظار'' میں ہیں کہ کب تیرا اشارہ ہو اور کب ہم اپنے سر کو کٹوا کر تیری امانت کے اس بوجھ سے سبکدوش ہوں۔

اب رسول اللہ ﷺ کے بعد قیامت تک کے زمانے کے لیے بھی اس لائحہ عمل کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے حضور ﷺ کے بعد اس نوعیت کی بیعت جس کسی کے ہاتھ پر بھی ہوگی وہ حضورؐ کا کوئی امتی ہی ہوگا۔ لہٰذا اس کی اطاعت مستقل بالذات اطاعت نہیں ہو گی بلکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کے دائرے کے اندر رہ کر ہوگی۔ چنانچہ اب اس نوعیت کی بیعت کسی ایسے داعی کے ہاتھ پر ہی ہونی چاہیے جو صرف اور صرف اللہ کے نام پر کھڑا ہو اور لوگوں کو قرآن اور دین کے نام پر پورے خلوص سے دعوت دے۔ پھر وہ اس دعوت پر لبیک کہنے والے افراد کو اقامتِ دین کی جدّوجُہد کے لیے ایک جمعیت کی شکل میں منظم کرنے کی کوشش بھی کرے۔ ظاہر ہے ''جمعیت'' کے بغیر اقامتِ دین کے لیے مؤثر اور منظم جدّوجُہد ممکن نہیں۔

جہاں تک جماعت سازی کے طریق کار کا تعلق ہے آج اس کے لیے بہت سے طریقے رائج ہیں۔ بعض تنظیمیں فارم کے ذریعے رکنیت سازی کرتی ہیں' بعض دستخطی مہم چلا کر ممبرز بناتی ہیں۔ کئی جماعتیں اپنے امیر کا انتخاب استصوابِ رائے کے ذریعے سے کرتی ہیں' پھر کہیں دو سال کے لیے امیر منتخب ہوتا ہے اور کہیں چار سال کے لیے' وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب طریقے جائز اور مباح ہیں' لیکن جماعت سازی کا منصوص' مسنون اور ماثور طریقہ بیعت کا طریقہ ہی ہے۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خندق کھودنے میں مصروف تھے تو وہ سب مل کر بلند آواز میں یہ شعر پڑھتے تھے:

نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا مُحَمَّدًا عَلَی الْجِهَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا [1]

۱۔ صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر' باب التحریض علی القتال۔ وصحیح مسلم' کتاب الجهاد والسیر' باب غزوۃ الاحزاب وهی الخندق۔

کہ ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے محمد ﷺ کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کر رکھی ہے اور اب یہ جہاد جاری رہے گا جب تک ہماری جان میں جان ہے۔

جماعت سازی کے لیے بیعت کا طریقہ نصِ قرآنی اور نصِ حدیث سے بھی ثابت ہوتا ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں مختلف مواقع پر صحابہؓ سے بیعت لی۔ حضور ﷺ کے بعد خلافت راشدہ کا سلسلہ بھی بیعت کی بنیاد پر چلا۔ خلیفہ کے انتخاب کے لیے جب طے شدہ طریقہ کار کے مطابق مشاورت ہو جاتی اور ایک فیصلہ کر لیا جاتا تو اس فیصلے پر باقاعدہ اعتماد کا اظہار لوگ بیعت کے ذریعے سے ہی کرتے تھے۔ پھر آگے چل کر جب خلافت کے بارے میں مسلمانوں میں اختلافات پیدا ہوئے تب بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے اپنی اپنی جمعیتوں کی تشکیل بیعت کی بنیاد پر ہی کی تھی۔ حتیٰ کہ دورِ ملوکیت میں بھی مسلمان بادشاہ عوام سے اعتماد کا ووٹ بھی بیعت کے ذریعے سے ہی لیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ پچھلی صدی میں مسلمانوں کے اندر جتنی جہادی تحریکیں اٹھیں' ان کی رکنیت سازی بھی بیعت کی بنیاد پر کی گئی۔ مثلاً سید احمد بریلویؒ کی سکھوں کے خلاف' مہدی سوڈانی کی انگریزوں کے خلاف اور سنوسیوں کی اطالویوں کے خلاف جہادی تحریکوں کو بیعت کی بنیاد پر ہی منظم کیا گیا۔ صوفیاء کے ہاں بھی اپنے مریدین کے تزکیۂ نفس کے لیے ''بیعت ارشاد'' کا سلسلہ رائج ہے۔

بہرحال اقامت دین کی جدّوجُہد کے لیے تنظیم سازی اور جمعیت ناگزیر ہے' کیونکہ اکیلا چنا تو بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ البتہ کسی داعی کی دعوت پر لبیک کہنے سے پہلے اس کی شخصیت' اس کے معمولات و معاملات' معیارِ تقویٰ' دین و دنیا کے بارے میں اس کے علم و شعور' اقامتِ دین کے لیے اس کی جدّوجُہد کے طریق کار وغیرہ کے بارے میں اچھی طرح سے تحقیق کر لیجیے۔ پھر جب کسی شخصیت کے بارے میں دل مطمئن ہو جائے کہ واقعی وہ اقامتِ دین کی جدّوجُہد کے بارے میں مخلص ہے اور باقی ضروری شرائط پر بھی پورا اُترتا ہے تو اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اس کا ساتھ دیجیے اور اس مقصد کے حصول کے لیے اللہ عزوجل اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کے اندر رہتے ہوئے اس کی اطاعت کو اپنے اوپر لازم کیجیے کیونکہ ''سمع و اطاعت'' کے بغیر نہ تو کوئی جمعیت قائم ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس کے بغیر کوئی تنظیم اپنے ہدف کے حصول کے لیے مؤثر جدّوجُہد کر سکتی ہے۔

آیات ۱۱ تا ۱۷

سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَ اَهْلُوْنَا
فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ قُلْ فَمَنْ
يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ۭ
بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۱﴾ بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ
الرَّسُوْلُ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّ زُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ
ظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۖ وَ كُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا ﴿۱۲﴾ وَ مَنْ لَّمْ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ
وَ رَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ﴿۱۳﴾ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ۭ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَ كَانَ اللّٰهُ
غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۴﴾ سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ
لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ۭ قُلْ
لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ
تَحْسُدُوْنَنَا ۭ بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵﴾ قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ
مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ
تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ۚ فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا ۚ وَ
اِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶﴾
لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى
الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ۭ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ وَ مَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۷﴾

دوسرے رکوع کی یہ آیات صلح حدیبیہ کے بعد حضور ﷺ کے واپسی کے سفر کے دوران نازل ہوئیں' بالکل اسی طرح جس طرح غزوۂ تبوک سے واپسی پر سورۃ التوبہ کی کچھ آیات نازل

ہوئی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مشیت کے تحت بعد میں نازل ہونے والی ان آیات کو پہلے سے جاری سلسلہ کلام کو منقطع کر کے یہاں پر رکھا گیا ہے۔ آیات کے تسلسل میں تقدیم و تاخیر کا بالکل یہی انداز اس سے پہلے ہم سورۃ التوبہ کے آغاز میں بھی دیکھ چکے ہیں۔ چنانچہ ان آیات کے مطالعہ سے پہلے یہ بات نوٹ کر لیجیے کہ پہلے رکوع کا مضمون یہاں پر منقطع ہو رہا ہے اور اس مضمون کا تسلسل اب تیسرے رکوع کے مضمون کے ساتھ جا کر ملے گا۔

آیت ۱۱ ﴿سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ﴾ ’’عنقریب آپؐ سے کہیں گے وہ لوگ جو پیچھے رہ جانے والے تھے دیہاتیوں میں سے‘‘

گویا رسول اللہ ﷺ کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ آپؐ کے مدینہ پہنچتے ہی اردگرد کے قبائل سے بادیہ نشین آپؐ کے پاس آ آ کر عذر پیش کریں گے کہ:

﴿شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَاَهْلُوْنَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ﴾ ’’ہمیں مشغول رکھا ہمارے اموال اور اہل و عیال (کی دیکھ بھال) نے‘ چنانچہ آپ ہمارے لیے استغفار کیجیے۔‘‘

حضور ﷺ نے تمام مسلمانوں پر عمرے کے لیے نکلنا لازم قرار نہیں دیا تھا۔ لیکن آپؐ نے اعلانِ عام کروایا تھا کہ جو کوئی عمرے کے لیے جا سکتا ہے ضرور چلے۔ بہر حال جو لوگ استطاعت کے باوجود آپؐ کے ساتھ نہیں گئے تھے یہ ان کی منافقت کا ذکر ہے کہ وہ آپؐ کے سامنے اپنی نام نہاد مصروفیات کے بہانے بنائیں گے۔

﴿يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ﴾ ’’یہ لوگ اپنی زبانوں سے وہ کچھ کہہ رہے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے۔‘‘

﴿قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ؕ﴾ ’’آپؐ (ان سے) کہیے کہ کون ہے جو کچھ اختیار رکھتا ہو تمہارے بارے میں اللہ کی طرف سے کچھ بھی اگر وہ تمہیں نقصان پہنچانے کا ارادہ کرے یا تمہیں نفع پہنچانے کا ارادہ کرے؟‘‘

اللہ تعالیٰ کا تمہارے بارے میں نفع یا نقصان کا جو بھی ارادہ ہو وہ تمہاری کسی تدبیر سے تبدیل نہیں ہو سکتا۔ اپنے گھروں میں رہ کر تم لوگ اللہ کی تقدیر کو نہیں بدل سکتے تھے۔ تمہارے

گھروں میں اگر کوئی خیر آنا تھی تو وہ تمہاری عدم موجودگی میں بھی آ سکتی تھی اور اگر کوئی شر تمہارے مقدر میں لکھا تھا تو وہ تمہاری موجودگی میں بھی آ سکتا تھا۔ لہٰذا ہمارے ساتھ نہ جانے کے جواز میں تمہارے سب دلائل بے معنی اور فضول ہیں۔

﴿بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝۱۱﴾ ’’بلکہ جو کچھ تم کرتے رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔‘‘

اب وہ بات بتائی جا رہی ہے جو اصل میں ان کے دلوں میں تھی۔

آیت ۱۲ ﴿بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا﴾ ’’بلکہ تم لوگوں نے یہ گمان کیا کہ اب رسولؐ اور اہلِ ایمان اپنے گھر والوں کی طرف کبھی بھی لوٹ کر نہیں آئیں گے‘‘

تمہارا خیال تھا کہ ان لوگوں کا دماغ چل گیا ہے جو خود چل کر موت کے منہ میں جا رہے ہیں اور یہ کہ قریشِ مکہ انہیں جیتے جی کبھی واپس نہیں آنے دیں گے۔

﴿وَزُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۚ﴾ ’’اور یہ بات تمہارے دلوں میں خوشنما بنا دی گئی اور تم نے بہت بُرا گمان کیا۔‘‘

﴿وَكُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا ۝۱۲﴾ ’’اور تم ہو ہی تباہ ہونے والے لوگ۔‘‘

اس سے پہلے سورۂ محمد میں منافقین کے جس طرزِ عمل کا ذکر ہوا تھا وہ ۲ ہجری کا دور تھا جبکہ ابھی قتال کا سلسلہ شروع ہونے والا تھا۔ اُس دور میں وہ لوگ ’’اقدام‘‘ سے متعلق حضور ﷺ کی حکمت عملی کے مقابلے میں صلح جوئی اور امن پسندی کی باتیں کرتے تھے۔ اب ان آیات میں ان کی ۶ ہجری کے زمانے کی سوچ کی عکاسی کی گئی ہے۔

آیت ۱۳ ﴿وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ۝۱۳﴾ ’’اور جو کوئی اللہ اور اُس کے رسولؐ پر ایمان نہ رکھے تو ہم نے ان کافروں کے لیے جہنّم تیار کر رکھی ہے۔‘‘

آیت ۱۴ ﴿وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ’’اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے۔‘‘

﴿یَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ﴾ ’’وہ بخشے گا جس کو چاہے گا اور عذاب دے گا جس کو چاہے گا۔‘‘

﴿وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۱۴﴾﴾ ’’اور اللہ بہت بخشنے والا‘ نہایت رحم کرنے والا ہے۔‘‘

آیت ۱۵ ﴿سَیَقُوۡلُ الۡمُخَلَّفُوۡنَ اِذَا انۡطَلَقۡتُمۡ اِلٰی مَغَانِمَ لِتَاۡخُذُوۡہَا ذَرُوۡنَا نَتَّبِعۡکُمۡ ۚ﴾ ’’(اے مسلمانو!) عنقریب یہی پیچھے رہنے والے کہیں گے‘ جب تم لوگ غنیمتیں حاصل کرنے کے لیے جاؤ گے‘ کہ ہمیں بھی اجازت دیجیے کہ ہم آپ کے ساتھ چلیں۔‘‘

اس آیت میں فتح خیبر کی طرف اشارہ ہے۔ خیبر یہودیوں کا بہت بڑا گڑھ تھا۔ مسلمانوں سے بدعہدی کی بنا پر جن دو یہودی قبائل (بنوقینقاع اور بنونضیر) کو مدینہ سے نکالا گیا تھا وہ بھی خیبر میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ اس علاقے میں انہوں نے بڑے بڑے قلعے بنا کر عسکری اعتبار سے خود کو بہت مضبوط کر لیا تھا۔ یہ لوگ ہر وقت مسلمانوں کے خلاف طرح طرح کی سازشوں کی منصوبہ بندیاں کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد جب قریش کی طرف سے جنگ وغیرہ کا کوئی خطرہ نہ رہا تو اگلے ہی سال یعنی ۷ ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے ان کی سرکوبی کے لیے پوری طاقت کے ساتھ خیبر پر چڑھائی کا فیصلہ کیا۔ یہاں ان آیات کے ذریعے مسلمانوں کو پیشگی (۶ ہجری میں) مطلع کیا جا رہا ہے کہ جب اگلے سال تم لوگ خیبر کی طرف پیش قدمی کرو گے تو اس کی فتح کو یقینی سمجھتے ہوئے اور وہاں سے بہت بڑے اموالِ غنیمت کی توقع کرتے ہوئے یہ منافقین بھی اس مہم پر تمہارے ساتھ جانے کے لیے تم سے اجازت مانگیں گے۔

﴿یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّبَدِّلُوۡا کَلٰمَ اللّٰہِ ؕ﴾ ’’یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے کلام کو تبدیل کر دیں!‘‘

گویا یہ لوگ اللہ کے اس حکم کو خلافِ واقعہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ خیبر کی مہم پر حضور ﷺ کے ساتھ صرف انہی لوگوں کو جانے کی اجازت دی جائے گی جو حدیبیہ کی مہم پر

آپؐ کے ساتھ گئے تھے اور بیعتِ رضوان میں شریک ہوئے تھے‘ جیسا کہ آگے آیات ۱۸‘۱۹ میں بصراحت ارشاد ہوا ہے۔

﴿قُلۡ لَّنۡ تَتَّبِعُوۡنَا کَذٰلِکُمۡ قَالَ اللّٰہُ مِنۡ قَبۡلُ ۚ﴾ ’’آپؐ کہیے کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں جاؤ گے‘ یہ بات اللہ پہلے ہی فرما چکا ہے۔‘‘

ان الفاظ کا اشارہ اسی سورت کی آیات ۱۸‘۱۹ کی طرف ہے‘ جو اس سے پہلے نازل ہو چکی تھیں۔

﴿فَسَیَقُوۡلُوۡنَ بَلۡ تَحۡسُدُوۡنَنَا ؕ﴾ ’’اس پر وہ کہیں گے: بلکہ آپ لوگ ہم سے حسد کر رہے ہیں۔‘‘

اس پر وہ آپ لوگوں پر الزام دھریں گے کہ آپ لوگ حسد کی بنا پر ہمیں اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتے کہ ہم بھی کہیں تمہیں حاصل ہونے والے اموالِ غنیمت میں حصہ دار نہ بن جائیں۔

﴿بَلۡ کَانُوۡا لَا یَفۡقَہُوۡنَ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۱۵﴾﴾ ’’بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ فہم ہی نہیں رکھتے مگر بہت کم۔‘‘

آیت ۱۶ ﴿قُلۡ لِّلۡمُخَلَّفِیۡنَ مِنَ الۡاَعۡرَابِ سَتُدۡعَوۡنَ اِلٰی قَوۡمٍ اُولِیۡ بَاۡسٍ شَدِیۡدٍ تُقَاتِلُوۡنَہُمۡ اَوۡ یُسۡلِمُوۡنَ ۚ﴾ ’’ان بدوؤں میں سے جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے آپؐ ان سے کہہ دیجیے کہ عنقریب تمہیں بلایا جائے گا ایک ایسی قوم کے ساتھ مقابلے کے لیے جو بہت طاقتور ہو گی‘ یا تو تم ان سے قتال کرو گے یا وہ اطاعت قبول کر لیں گے۔‘‘

ان الفاظ میں جنگوں کے اس طویل سلسلے کی طرف اشارہ ہے جو چند سال بعد سلطنتِ روما اور سلطنتِ ایران کے خلاف شروع ہونے والا تھا۔ گویا یہ انقلابِ محمدیؐ کی بین الاقوامی سطح پر پیش قدمی کے بارے میں پیشین گوئی ہے کہ جزیرہ نمائے عرب کا پورا علاقہ تمہارے زیر تسلط آ جانے کے بعد عنقریب تمہارا ٹکراؤ سلطنتِ روما اور سلطنتِ ایران کی ایسی افواج سے ہو گا جن کی تعداد لاکھوں میں ہے اور وہ اپنے زمانے کے جدید ترین سامانِ حرب سے لیس ہیں۔ چنانچہ اے نبی ﷺ! آپ ان اعراب سے کہیں کہ توسیع و تصدیر انقلاب کے اس مرحلے میں تم لوگوں کو بھی اپنی سابقہ کوتاہیوں کی تلافی کرنے کا موقع دیا جائے گا۔

﴿فَاِنۡ تُطِیۡعُوۡا یُؤۡتِکُمُ اللّٰہُ اَجۡرًا حَسَنًا ۚ﴾ ’’تو اس وقت اگر تم اطاعت کرو گے

تو اللہ تمہیں بہت اچھا اجر دے گا۔‘‘

اگر تم لوگ ان معرکوں میں اللہ ربّ العزت اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا دم بھرتے ہوئے اس کے رسولؐ کے مشن کے علمبردار بنو گے تو اللہ تعالیٰ سے اس کا بہت اچھا صلہ پالو گے۔

﴿وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶﴾﴾ ’’لیکن اگر تم نے (اس موقع پر بھی) پیٹھ دکھا دی جیسے کہ تم نے پہلے پیٹھ دکھائی تھی تو وہ تمہیں بہت دردناک عذاب دے گا۔‘‘

یہاں پر یہ اہم نکتہ نوٹ کر لیجئے کہ ﴿تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ۚ﴾ کے الفاظ میں کسی قوم کے ساتھ مقابلے میں تین ممکنہ صورتوں کا ذکر ہے۔ ’’تُقَاتِلُوْنَهُمْ‘‘ میں مخالف فریق کے ساتھ مقابلے اور جنگ کی طرف اشارہ ہے جبکہ ’’يُسْلِمُوْنَ‘‘ میں ان کے اسلام لانے یا اطاعت قبول کرنے کی دونوں صورتیں شامل ہیں۔ چنانچہ عرب سے باہر مسلمانوں کا جہاں کہیں بھی کوئی معرکہ ہوتا تھا اس میں ان کی طرف سے مخالف فریق کے سامنے یہی تین نکات پیش کیے جاتے تھے۔

آیت ۱۷ ﴿لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ؕ﴾ ’’ہاں کسی اندھے پر کوئی تنگی نہیں اور نہ ہی کسی لنگڑے پر اور نہ ہی کسی مریض پر کوئی تنگی ہے۔‘‘

اگر جسمانی لحاظ سے کوئی معذور شخص جہاد میں حصّہ نہیں لیتا تو اس کی معذوری کے پیش نظر اس پر اس حوالے سے کوئی سختی نہیں کی جائے گی۔

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ﴾ ’’اور جو اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرے گا تو وہ داخل کرے گا اس کو ان باغات مین جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی۔‘‘

﴿وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۷﴾﴾ ’’اور جو کوئی پیٹھ پھیر لے تو اسے وہ ایک دردناک عذاب سے دوچار کرے گا۔‘‘

یزید کی ولی عہدی اور سانحۂ کربلا

کا تاریخی پس منظر

فلسفۂ انقلاب کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کا جامع مسجد دارالسلام باغِ جناح' لاہور میں ۱۹ ستمبر ۱۹۸۶ء کا خطابِ جمعہ' جو دراصل گزشتہ خطابِ جمعہ کا تتمہ ہے' جو میثاق کے شمارہ جولائی ۲۰ء میں شائع ہو چکا ہے۔ (ادارہ)

یزید کی ولی عہدی

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بیس سالہ دورِ حکومت میں دس سال (۴۱ سے ۵۱ ہجری) تک کوئی اختلاف رونما نہیں ہوا۔ تمام اُمّت ایک جھنڈے تلے جمع تھی اور باہمی اتحاد کی کیفیت مثالی تھی۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے تعلقات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دونوں صاحبزادوں حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے ساتھ انتہائی خوشگوار تھے۔ یہ دونوں حضرات دمشق جاتے تھے اور امیر معاویہؓ اُن کا اکرام فرماتے تھے' بڑے بڑے ہدایہ پیش کرتے تھے۔ ایک بہت اہم بات یہ ہے کہ امیر معاویہؓ نے حضرت حسنؓ کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا' اور وہ قطعاً کسی موروثی اور خاندانی بادشاہت کی بنیاد رکھنے کے خواہش مند نہیں تھے۔ لیکن حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد پھر سوال پیدا ہوا کہ آیا اُمّت کی قیادت کا مسئلہ حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جائے یا اس مسئلے کو طے کر دیا جائے۔ اس موقع پر کچھ حضرات نے امیر معاویہؓ کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی کہ وہ اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین مقرر کر دیں۔ تجویز پیش

کرنے والوں میں ایک جلیل القدر صحابی حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں۔ ان کا تعلق نہ بنو ہاشم سے ہے' نہ بنوامیہ سے۔ یہ طائف کے رہنے والے ثقفی ہیں۔ ان کے شرفِ صحابیت کا اندازہ اس بات سے کر لیجیے کہ یہ بیعت رضوان میں شامل تھے۔ بیعت رضوان ۶ ہجری میں ہوئی اور اِس وقت گفتگو ہو رہی ہے ۵۱ھ کی۔ ان کا ۴۵ برس کا کردار سامنے ہے۔ اور ہر چیز سے بڑھ کر اصحابِ بیعت رضوان کے حق میں اللہ تعالیٰ کی گواہی قرآن حکیم میں ثبت ہے:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۱۸﴾﴾

(الفتح)

''(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!) اللہ اہل ایمان سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے' تو ان کے دلوں کا حال اُس کو معلوم تھا' اس لیے اللہ نے ان پر سکینت نازل فرمائی اور انہیں انعام میں قریبی فتح عطا کی۔''

پورے دورِ خلافت راشدہ میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے پاس اہم عہدے رہے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہؓ (نعوذ باللہ!) عہدوں اور مناصب کے بھوکے تھے۔ اس وقت ان کی عمر بھی لگ بھگ ستّر برس تھی۔ انتہائی مدبر اور معاملہ فہم شخصیت کے مالک تھے۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے اختلافات میں انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا تھا۔ آج کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے اپنی گورنری بچانے کے لیے یہ مشورہ دیا تھا۔ کہنے والے یہ بھی نہیں سوچتے کہ یکے از اصحابِ بیعتِ رضوان کے بارے میں وہ کیا کہہ رہے ہیں! ہم تو اصحابِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں یہ گمان بھی نہیں کر سکتے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے مشورے کے باوجود حضرت معاویہؓ متردّد رہے۔ اس کے بعد مملکت اسلامیہ کے مختلف علاقوں سے وفود آنے لگے جنہوں نے یہی مشورہ دیا۔ یہاں تک کہ حضرت معاویہؓ نے یزید کو اپنا جانشین نامزد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اہلِ سُنّت کا مسلک یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ اجتہاد پر مبنی ہے۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی ہیں۔

اہلِ سُنّت کے متفقہ اجماعی عقیدے ''اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ عَدُوْل'' کی رُو سے ہم کسی صحابی کی نیت پر شک کریں گے تو ہمارا ایمان محفوظ نہیں۔ ہاں اجتہادی غلطی ہوسکتی ہے' لیکن خطائے اجتہادی پر بھی مجتہد کو اکہرا ثواب ملتا ہے اور اگر اجتہاد درست ہو تو دہرا ثواب ملتا ہے۔ اس اجتہاد کے حق میں جو دلائل ہیں ان پر تفصیلی گفتگو میں ''سانحہ کربلا'' نامی کتابچہ میں کر چکا ہوں۔ جس شخصیت نے بیس برس تک بلخ و بخارا سے لے کر بحر اوقیانوس تک اور یمن سے لے کر ایشیائے کوچک تک پھیلی ہوئی تاریخ کی عظیم ترین سلطنت پر حکومت کی ہو' کیا وہ سیاست و تدبر' معاملہ فہمی اور دور اندیشی سے تہی دست ہوسکتی ہے!

حضرت امیر معاویہؓ نے دیکھا کہ کبارِ صحابہ کی پہلی نسل بالعموم اس دنیا سے جا چکی' اب ان کی اگلی نسل کے کچھ بزرگ موجود ہیں۔ مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ جا چکے' ان کے بیٹے حضرت حسین رضی اللہ عنہ موجود ہیں' حضرت زبیر جا چکے' عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما موجود ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اللہ کے پاس جا چکے' ان کے صاحبزادے عبداللہ رضی اللہ عنہ موجود ہیں۔ دوسری طرف عالمِ اسلام بہت وسیع ہو چکا۔ اس کی عظیم اکثریت نومسلموں پر مشتمل ہے۔ اس لیے حکومت کی وہ آئیڈل صورت جو عہدِ خلافتِ راشدہ میں پائی جاتی تھی اب برقرار نہیں رہ سکتی جب تک اس کی پشت پر کسی طاقتور قبیلے کی حمایت موجود نہ ہو۔ میرے نزدیک یہ تھیں وہ وجوہات جن کی بنا پر امیر معاویہؓ نے یہ اجتہاد کیا۔ لیکن اگر کوئی کہے کہ ان سے غلطی ہوگئی تھی تو میں اس سے لڑوں گا نہیں۔ اگر غلطی تھی بھی تو اجتہادی غلطی تھی۔ حضرت معاویہؓ کے اس فیصلے سے صرف پانچ اصحابؓ نے اختلاف کیا اور انہوں نے یزید کی ولی عہدی کی بیعت نہیں کی۔ ان میں حضرت صدیق اکبر کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمٰن' حضرت عمر کے فرزند حضرت عبداللہ' حضرت عباس کے بیٹے حضرت عبداللہ' حضرت زبیر کے لختِ جگر حضرت عبداللہ اور حضرت علی کے نورِ نظر حضرت حسین رضی اللہ عنہم شامل تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کا یہ تبصرہ بھی روایات میں موجود ہے کہ ''یہ قیصر و کسریٰ کی سُنّت کو جاری کیا جا رہا ہے۔''

یزید کی ولی عہدی کی بیعت کے بعد امیر معاویہؓ دس برس زندہ رہے' لیکن انتہائی تدبر اور دُور اندیشی سے کام لیتے ہوئے انہوں نے اس معاملے میں کسی پر کوئی سختی یا تشدد

نہیں کیا اور نہ ہی حضرت حسین رضی اللہ عنہ یا بیعت نہ کرنے والے دیگر اصحاب میں سے کسی نے اس فیصلے کے خلاف کوئی احتجاج یا ہنگامہ کرنے کی کوشش کی۔

حکومتِ یزید اور اختلافِ صحابہؓ

جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو ایک حقیقی صورت حال نمودار ہوئی اور پھر اجتہاد کا مرحلہ آیا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کا انتقال ہو چکا تھا' باقی چاروں حضرات نے جو اجتہادی رائے قائم کی اسے بھی سمجھ لیجیے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما دونوں کی رائے یہ ہوئی کہ اگرچہ فیصلہ غلط ہوا ہے لیکن کوئی کفر بھی نہیں ہوا۔ اتنا غلط بھی نہیں ہوا کہ ہم بغاوت کر دیں اور ملّتِ اسلامیہ کے اندر کوئی اختلاف وافتراق اور ہنگامہ کھڑا کر دیں۔ ان دونوں اصحاب کے علم و فضل اور مقام و مرتبہ کو بھی دیکھ لیجیے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ''حِبْرُ الْاُمَّۃ''(۱) کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں' ہماری تفسیری روایات کے سب سے بڑے راوی ہیں۔ آپؓ کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا کتب احادیث میں موجود ہے کہ اَللّٰھُمَّ فَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ وَ عَلِّمْہُ التَّاوِیْلَ (اے اللہ! اس کو دین کی سمجھ عطا کر دے اور علم تاویل(۲) سکھا دے)۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا قبول نہ ہوئی ہوگی! خاندانی قرابت بھی دیکھ لیجیے۔ والدؓ کی طرف سے حضرت حسینؓ کے چچا ہیں' اس لیے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما دونوں چچا زاد بھائی ہیں۔ والدہؓ کی طرف سے حضرت حسینؓ کے نانا ہیں' اس لیے کہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھی چچا زاد بھائی ہیں۔ یہ ہیں حضرت عبداللہ بن

(۱) عربی زبان میں حِبر کا لغوی معنی ''دوات کی روشنائی'' ہے۔ قدیم زمانے میں یہ لفظ استعارۃً ان بڑے علماء کے لیے استعمال ہوتا تھا جو تصنیف و تالیف کے کام میں روشنائی استعمال کرتے تھے۔ اس کی جمع ''احبار'' ہے۔

(۲) علومِ قرآن میں تاویل کا لفظ عام طور پر تفسیر کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے۔ تفسیر سے مراد آیاتِ قرآنی کی ایسی تشریح و توضیح ہے جو قطعی اور یقینی ہو اور تاویل سے مراد ایسی ظنی تشریح و توضیح ہے جس کی بنیاد عقل پر ہو مگر وہ مسلّماتِ شرعیہ و لغویہ سے ٹکراتی نہ ہو۔ امام ابن تیمیہؒ تاویل سے آیات کے مصداقاتِ خارجیہ مراد لیتے ہیں۔

عباس ؓ —— حضرت عبداللہ بن عمر ؓ حدیث کے مستند ترین، مختصر ترین اور مشہور سلسلہ روایت ''سلسلۃ الذہب'' (سنہری زنجیر) کی پہلی کڑی ہیں: امام مالک عن نافعؒ عن عبداللہؓ بن عمرؓ عن رسول اللہ ﷺ۔

حضرت عبداللہ بن عباس ؓ اور حضرت عبداللہ بن عمر ؓ کے برعکس حضرت عبداللہ بن زبیر ؓ اور حضرت حسین بن علی ؓ کی رائے یہ بنی کہ اس غلط فیصلے کے خلاف ہمیں کھڑے ہوجانا چاہیے۔ چاروں حضرات نے اپنی اپنی اجتہادی رائے قائم کی۔ غلط کون تھا اور صحیح کون، اس کا فیصلہ ہم نہیں کر سکتے۔ یہ فیصلہ تو اللہ کے ہاں ہوگا۔ ان کی اجتہادی رائے سے اتفاق یا اختلاف کرنے کا حق ہر ایک کو حاصل ہے، لیکن ان کی نیت پر حملہ کرنا ہمارے ایمان کے لیے خطرہ ہے۔

یہ اصحابِ رسول ﷺ ہیں۔ ان کی تربیت، ان کا تزکیۂ نفس اور تجلیۂ روح محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے سرانجام دیا ہے۔ ان کی نیت پر حملہ حضور ﷺ پر حملہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر ؓ کی شخصیت و مقام کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ان کے والد حضرت زبیر بن عوام ؓ جلیل القدر صحابی، ان کی والدہ جلیل القدر صحابیہ حضرت اسماء ؓ خلیفۃ الرسول حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی بڑی صاحبزادی اور زوجۂ رسول ﷺ حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کی بڑی بہن۔ یعنی ایک نواسۂ رسول ﷺ ہیں حضرت حسین ؓ اور ایک نواسۂ صدیق اکبر ؓ ہیں حضرت عبداللہ بن زبیر ؓ۔ ان دونوں کا فیصلہ تھا کہ ہمیں یزید کی خلافت قبول نہیں۔ اب وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ نواسہ صدیق اکبرؓ نے نواسۂ رسول ﷺ کو پیش کش کی کہ میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں، آپ یہیں پر قیام کیجیے، حجاز کی مقدّس سرزمین کو اپنا مرکز بنائیے، یہاں بزرگ صحابہ کرام موجود ہیں، یہاں حرمین شریفین ہیں، ہمیں جو مزاحمتی تحریک چلانی ہے یہاں سے چلائیں گے۔

سانحۂ کربلا میں اہلِ کوفہ کا کردار

حضرت حسین ؓ کا اپنا اجتہاد تھا۔ انہوں نے حضرت عبداللہ بن زبیر ؓ کی رائے سے اتفاق نہیں کیا، بلکہ سبائیوں کے مرکز کوفہ جانے کا فیصلہ کرلیا، جب کہ کوفہ ایرانی

نیشنل ازم کے انتقام اور یہودی سازش کا مقامِ اتّصال تھا۔ ایرانیوں کی شاہ پرستی کا عالَم آج بھی دیکھ لیجیے۔ آج کے ایران (۱۹۸۶ء) میں شاہ کا بیٹا ایرانی ٹیلی ویژن پر ظاہر ہوگیا۔ اسی سے چودہ سو برس پہلے کے جذبات کا اندازہ کر لیجیے۔ حضرت معاویہؓ کے بیس سالہ عہدِ حکومت میں انہیں اپنی ریشہ دوانیوں کا کوئی موقعہ نہیں مل سکا تھا۔ ان کی وفات پر انہوں نے فوراً حضرت حسینؓ کے نام خطوط کا ایک سلسلہ قائم کر دیا کہ آپ جلد از جلد تشریف لائیے، ہم نے کسی کی بیعت نہیں کی، ہم بسروچشم آپ کی بیعت کریں گے۔ حالات کی تفتیش کے لیے حضرت حسینؓ نے اپنے چچازاد بھائی حضرت مسلم بن عقیل کو بھیجا تو ان کے ہاتھ پر ہزاروں لوگوں نے بیعت کرلی۔ انہوں نے فوراً حضرت حسینؓ کو پیغام بھیج دیا کہ کوفہ آنے میں کوئی قباحت نہیں۔ لیکن جونہی یزید نے عبیداللہ بن زیاد کو گورنر بنا کر بھیجا ان کی وفاداریوں کا ملمع اُتر گیا۔ نئے گورنر نے محض ایک دھمکی دی اور سب کے سب حضرت حسینؓ کی بیعت سے دستبردار ہوگئے۔ حضرت مسلم بن عقیل کو پناہ دینے والا کوئی نہ رہا اور انتہائی کسمپرسی کے عالَم میں انہیں شہید کر دیا گیا۔ جب انہیں ابن زیاد کے پاس لے جایا جارہا تھا تو ایک کوفی نے انہیں روتا دیکھ کر پھبتی کسی کہ حکومتوں کے طلب گار رویا نہیں کرتے! انہوں نے فوراً جواب دیا: بدبخت! میں اپنے لیے نہیں رو رہا، میں حسینؓ کے لیے رو رہا ہوں، میں انہیں پیغام بھیج چکا ہوں اور وہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ روانہ ہو چکے ہوں گے۔ اب خود اندازہ کیجیے سازشی کون تھا!

اس کے مقابلے میں مکہ میں حضرت عبداللہ بن زبیر ؓ کی حکومت بارہ برس تک قائم رہی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ پورے حجاز اور عرب کے بعض دوسرے علاقوں کے مسلمانوں نے بھی ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی تھی۔ اگر صدیق اکبر ؓ کے نواسے کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے نواسے بھی وہیں پر موجود رہتے تو یہ کتنی بڑی قوت بن جاتی۔ شاید کہ ملوکیت کا سلسلہ اُسی وقت ختم ہوجاتا۔ البتہ کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اگر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ حضرت حسینؓ کا ساتھ دیتے تو کربلا کا سانحہ پیش نہ آتا۔ لیکن یہ فیصلے کہیں اور ہوتے ہیں۔ کوئی چیز ہونی ہوتی ہے تو وہ ہوجاتی ہے۔ یہ تقدیر کی باتیں ہیں۔

سانحۂ کربلا کے اہم کردار

سانحۂ کربلا کی شخصیتوں کو پہچانیے۔ پہلی شخصیت ہے کوفے کا گورنر ابن زیاد یعنی زیاد کا بیٹا۔ دوسری شخصیت جسے لشکر دے کر حضرت حسینؓ کا مقابلہ کرنے بھیجا گیا' ابن سعد یعنی سعد کا بیٹا۔ سعد کون؟ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ' صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فاتح ایران' یکے از عشرۂ مبشرہ رضی اللہ عنہم۔ پھر ایک نام آتا ہے شمر کا اور ایک نام آتا ہے حُر کا۔ یہ چاروں نام اس سانحہ میں بہت اہمیت کے حامل ہیں' لہٰذا اس وقت ہم انہی چاروں کا تعارف حاصل کرتے ہیں۔

عبید اللہ بن زیاد یعنی زیاد کا بیٹا عبید اللہ۔ پہلے باپ کو پہچانئے' پھر بیٹے کو۔ زیاد کو زیاد بن سمیہ یا زیاد بن ابیہ کہا جاتا تھا' اس لیے کہ وہ مجہول النسب تھا' معلوم نہیں تھا کہ اس کا باپ کون ہے۔ اس ضمن میں یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ دورِ جاہلیت میں ابوسفیان کہیں مہمان گئے۔ وہاں عرب کے رواج کے مطابق رات کو انہیں سُمیہ نامی لونڈی پیش کی گئی۔ وہ ابوسفیان سے حاملہ ہوئی اور یہ زیاد نامی لڑکا پیدا ہوا۔ کنیز چونکہ کسی اور کی تھی اور اسے بھی یہ معلوم تھا کہ یہ لڑکا میری صلب سے نہیں ہے اس لیے لڑکے کا نسب رواج کے مطابق باپ کی بجائے ماں سے منسوب کیا گیا۔ یا یہ کہا گیا کہ ''زیاد بن ابیہ'' یعنی زیاد اپنے باپ کا بیٹا۔ حضرت ابوسفیانؓ بھی اس حقیقت سے باخبر تھے اور انہوں نے حضرت معاویہؓ کو بھی بتا دیا تھا کہ یہ شخص میری صلب سے ہے' میرا بیٹا ہے۔ یہ شخص بہت ذہین' معاملہ فہم اور ذکی تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں کئی مناصب پر فائز رہا۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں بصرہ کا گورنر تھا۔ اس ضمن میں ایک اہم اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے جھگڑے میں اس نے حضرت علیؓ کا ساتھ دیا' حتیٰ کہ حضرت حسنؓ اور امیر معاویہؓ کی صلح کے بعد بھی ایک عرصے تک اس نے حضرت معاویہؓ کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا اور ترکستان کے علاقے میں اپنا مرکز بنا کر باغیانہ سرگرمیاں جاری رکھیں۔ آخر کار حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی کوششوں سے یہ دِمشق میں امیر معاویہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ امیر معاویہؓ نے اپنے والد کی وصیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے اسے اپنا بھائی تسلیم کیا اور یوں اس صلح کے نتیجے میں اسے زیاد بن ابی سفیانؓ کے طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ ۵۳ھ میں زیاد کا انتقال ہوا۔

اس کا بیٹا ہے عبید اللہ بن زیاد' گورنر کوفہ۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ شخص یقیناً اس سازش کا بہت بڑا مہرہ اور اس سانحے کا بہت بڑا ذمہ دار ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ یزید نے سانحۂ کربلا کے بعد اس شخص کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: ''اللہ سمیہ کی نسل پر لعنت کرے' اس نے وہ کچھ کیا جس سے کم پر میں راضی ہو سکتا تھا''۔ لیکن نوٹ کیجیے کہ یزید دِمشق میں تھا اور یہ معاملہ ہوا کوفہ کے قریب کربلا میں۔ سینکڑوں میلوں کا فاصلہ ہے۔ آج کل کی طرح مرکز سے ہر وقت رابطہ ممکن نہیں۔ ایک حکم ملا ہوا ہے کہ حضرت حسینؓ سے بیعت لینی ہے۔ اس حکم کی آڑ میں اس نے ساری من مانی کی۔ اس نے پہلا لشکر بھیجا عمرو بن سعدؓ بن ابی وقاص کی قیادت میں۔ یہ لشکر رَے پر حملے کے لیے تیار کیا گیا تھا' ابن زیاد نے اسے کربلا کی طرف روانہ کر دیا۔ عمرو بن سعدؓ نے کوشش کی کہ حضرت حسینؓ سے مصالحت ہو جائے۔ اسی لشکر کے ہراول دستے کے طور پر حُر آئے تھے۔ ان کے والد کا نام بھی یزید تھا' جسے آج گالی بنا دیا گیا ہے: حُر بن یزید تمیمی۔ حضرت حُرؒ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی تقریریں سنیں تو اپنا لشکر چھوڑ کر حضرت حسینؓ کے لشکر میں جا شامل ہوئے اور جامِ شہادت نوش کیا۔ عمرو بن سعدؓ نے جب لیت و لعل کی پالیسی اختیار کی تو ابن زیاد نے غصے سے بھرا ہوا خط لکھا کہ اگر تم فیصلہ کن اقدام نہیں کر سکتے تو قیادت شمر ذی الجوشن کے حوالے کر دو۔ اُس وقت عمرو بن سعدؓ حضرت حُرؒ والا راستہ بھی اختیار کر سکتے تھے' لیکن وہ ایسا نہ کر سکے۔ ان کا منصب ان کے پاؤں کی بیڑی بن گیا۔

حضرت حسینؓ کی شرائط اور سبائیوں کا ردِّعمل

اب آیئے معاملے کی اصل حقیقت کی طرف۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کوفیوں کے لشکر کے سامنے تقریریں کیں۔ ایک ایک کوفی کا نام لے کر کہا کہ اے فلاں ابن فلاں کیا تم نے مجھے خط نہیں لکھے تھے؟ یہ تمہارے خطوط میرے پاس موجود ہیں۔ انہوں نے کہا: نہیں! نہیں تم جھوٹ بولتے ہو' ہم نے کوئی خط نہیں لکھا۔ درحقیقت حضرت حسینؓ کی پیش کردہ تینوں شرائط میں سے کسی ایک کی منظوری کی صورت میں ان سبائی کوفیوں کو اپنی سازش کا بھانڈا پھوٹتا نظر آ رہا تھا۔ حضرت حسینؓ نے تو پیش کش کی تھی کہ مجھے واپس لوٹ جانے دو

جہاں سے میں آیا ہوں' یا مجھے دمشق جانے دو میں یزید سے خود معاملہ طے کرلوں۔ بعض روایات میں تو یہاں تک الفاظ آئے ہیں کہ میں اُسی طرح اُس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دوں جس طرح میرے بھائی نے اس کے باپ کے ہاتھ میں ہاتھ دیا تھا۔ اور اگر یہ بھی قبول نہیں تو مجھے جہاد کے لیے سرحدوں پر جانے دو تاکہ توسیع انقلابِ محمدی ﷺ میں اپنی زندگی کھپادوں اور اندر کے ان خرخشوں سے میرا دامن صاف ہو جائے۔ وہ سازشی کوفی جنہیں صلح کی صورت میں اپنا بھانڈا پھوٹتا نظر آتا تھا انہوں نے جلدی مچائی اور صلح نہیں ہونے دی۔ انہوں نے حضرت حسینؓ اور ان کے قافلے کو شہید کیا ہے۔ یہ سب عبداللہ بن سبا کے پیروکار تھے۔ یہ مسلمانوں کی خانہ جنگی نہیں تھی' بلکہ سبائیوں کی بہت بڑی سازش تھی۔

معاویہؓ و حسینؓ کے حالات میں مماثلت

ایک اہم نکتہ جو ''سانحۂ کربلا'' میں بیان نہیں ہوا یہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ یہیں ہتھیار ڈال دو' surrender کردو۔ یہ بات صرف ان کی شجاعت اور حمیت کے منافی ہی نہیں تھی بلکہ حضرت حسینؓ کو صاف نظر آ رہا تھا کہ اپنے آپ کو ان لوگوں کے حوالے کر دینے کے بعد انہیں یزید تک نہیں جانے دیا جائے گا بلکہ یہیں ان کو شہید کر دیا جائے گا۔ لہٰذا حضرتِ حسینؓ نے فیصلہ کیا کہ اگر مرنا ہی ہے تو اس طرح نہیں مرنا' بلکہ بقول شاعر ؎

مرنے چلے تو سطوتِ قاتل کا خوف کیا
اتنا تو ہو کہ باندھنے پائے نہ دست و پا
مقتل میں کچھ تو رنگ جمے جشن رقص کا
آلودہ خوں سے پنجۂ صیاد کچھ تو ہو!
خوں پر گواہ دامن جلّاد کچھ تو ہو
جب خوں بہا طلب کریں بنیاد کچھ تو ہو!

حضرت حسینؓ کو اس طرح بے دست و پا ہو کر مرنا پسند نہیں تھا۔ اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے تو کوفی انہیں اپنے خلاف دستاویزی ثبوت لے کر دِمشق کے

دربار تک کبھی جانے نہ دیتے' فوراً ان کی گردن اڑا دیتے۔ لہٰذا حضرت حسینؓ نے شجاعت کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے' اپنی جان اور اپنی آن کی مدافعت کرتے ہوئے' عزّت کے ساتھ شہادت کی موت کو خوش آمدید کہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی کیفیت بھی کچھ یہی تھی۔ حضرت معاویہؓ کو نظر آ رہا تھا کہ حضرت علیؓ کو سبائی سازشیوں نے گھیرے میں لیا ہوا ہے۔ یہ سبائی ہی تھے جو ہر موقع پر صلح کے راستے میں رکاوٹ ڈالتے تھے۔ ورنہ جنگِ جمل کے موقع پر بھی صلح ہو رہی تھی اور جنگِ صفّین کے موقع پر بھی۔ حضرت معاویہؓ سمجھتے تھے کہ اگر میں ہتھیار ڈالتا ہوں تو مجھے حضرت علیؓ تک پہنچنے ہی نہیں دیا جائے گا' فوراً میری گردن اڑا دی جائے گی۔ ورنہ حضرت معاویہؓ نے کبھی یہ نہیں کہا کہ مجھے علیؓ کی خلافت منظور نہیں اور نہ ہی انہوں نے کبھی خلافت کی بیعت لی۔ ان کا مطالبہ صرف یہ تھا کہ پہلے ان سازشیوں سے اپنے آپ کو علیحدہ کیجیے' جن کے ہاتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون سے رنگین ہیں انہیں اپنے اردگرد سے ہٹایئے۔ حضرت علیؓ یہ فرماتے تھے کہ میرے پاس طاقت نہیں' آپ میرا ساتھ دیں تو میں انہیں ہٹاؤں۔ یہ عقدۂ لاینحل تھا جو حل نہ ہو سکا۔ یہ الجھن تھی جس پر قابو نہ پایا جا سکا۔

حضرت حسینؓ اور حضرت معاویہؓ کے حالات میں فرق صرف یہ تھا کہ کربلا میں حضرت حسینؓ کے ان ساتھیوں نے' جنہوں نے خط لکھ لکھ کر انہیں بلایا تھا' ان سے بے وفائی کی' جبکہ جو لوگ حضرت علیؓ کے مقابلے میں حضرت معاویہؓ کے ساتھی تھے وہ آخر وقت تک ان کے وفادار رہے۔ ورنہ صورتحال وہاں بھی یہی ہوتی۔ حضرت معاویہؓ بھی اسی طرح شہید کر دیے جاتے جس طرح حضرت حسینؓ شہید کر دیے گئے' اور اگر ان کے پاس بھی طاقت نہ ہوتی تو وہ کبھی ہتھیار نہ ڈالتے' سرنڈر نہ کرتے۔ ان حقائق کو سمجھئے اور اگر کہیں اختلاف ہو تو دلیل کا جواب دلیل سے دیجیے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

یہاں بہت سے دوستوں کے ذہن میں اُبھرنے والی ایک الجھن کو رفع کرنا بھی ضروری ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان حقائق کا بیان کرنا کیوں ضروری ہے! اس بات کو

اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ غلبۂ دین کی جِدّ وجُہد اور اسلامی انقلاب کی تیاری کے لیے لازم ہے کہ ہم اللہ کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ اور اُن کے اصحاب رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے کردار پر جو بھی حملے کیے جاتے ہیں اُن کا دفاع کریں‘ کیونکہ اُن کا طرزِ عمل اور اُن کا کردار ہماری ساری جِدّ وجُہد کے لیے دلیل و برہان اور نمونے کا درجہ رکھتا ہے۔ بالفاظِ قرآنی:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۫ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ﴾ (الفتح:۲۹)

’’محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو لوگ اُن کے ساتھ ہیں وہ کفار پر بہت سخت اور آپس میں بہت رحم دل ہیں۔ تم دیکھو گے اُنہیں رکوع و سجود کرتے ہوئے‘ انہیں اللہ کے فضل اور اُس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے‘ سجدوں کے اثرات اُن کے چہروں پر موجود ہیں‘ جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں۔‘‘

جب تک یہ تاریکیاں چھانٹ نہ دی جائیں گی‘ جب تک یہ مغالطے رفع نہ کیے جائیں گے اُس وقت تک لوگ دین کی جِدّ وجُہد کے لیے کھڑے نہیں ہوں گے۔ اُن کے سامنے تو یہ تصویر بھی پیش کی جا رہی ہے کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے جو جماعت تیار کی تھی اُس میں بس چند گنے چنے صاحبِ ایمان تھے‘ اکثر منافق تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو نہ منافق تھے نہ مومن۔ اللہ کے آخری رسول ﷺ کی ۲۳ برس کی محنت شاقہ کا یہ نتیجہ بتایا جا رہا ہے! آپ ﷺ کے تین خلفاء کو غاصب کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ایک دن کے لیے بھی صحیح اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی —— اور جب اُس وقت قائم نہیں ہوئی تو اب کہاں سے ہو جائے گی! معاذ اللہ‘ ثم معاذ اللہ۔ ان باتوں کو سن کر کیسے کسی کے دل میں یہ جذبہ اُبھر سکتا ہے کہ یہ کام دوبارہ ہو سکتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کے کام کا جب یہ حشر ہوا تو آج کوئی کیا کر سکتا ہے؟ جب تک ان حقائق کو سامنے نہیں لایا جائے گا لوگوں کی غلط فہمیاں کیسے دور ہوں گی؟

موجودہ حالات میں ہمارا طریقِ کار

ہمارا یقین اور ایمان ہے کہ ایک دن اللہ کا دین پوری دُنیا پر غالب ہو کر رہے گا اور وہ وقت اب دور نہیں ہے۔ لیکن اس کے لیے جِدّ وجُہد کرنی پڑے گی۔ وہ طریق کار سیکھنا پڑے گا اور اختیار کرنا پڑے گا جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں نے اختیار کیا۔ امام مالکؒ کا قول میں آپ کو بارہا سنا چکا ہوں کہ ’’اس اُمت کے آخری حصے کی اصلاح بھی اُسی طرح ہو گی جس طرح اس کے پہلے حصے کی اصلاح ہوئی تھی‘‘۔ ایک ادنیٰ اُمتی کی حیثیت سے میں نے بھی اُسی کام کا آغاز کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا تھا: ﴿فَلِذٰلِكَ فَادْعُ﴾ ’’تو آپؐ اسی کی دعوت دیتے رہیے!‘‘ آنحضور ﷺ کا ادنیٰ امتی ہونے کی حیثیت سے میں بھی اُسی دین کی طرف بلا رہا ہوں۔ میری دعوت میں فرقہ واریت کا کوئی شائبہ بھی نہیں۔ میں نے کسی مسئلے کو ایشو نہیں بنایا۔ آج تک نور و بشر کا مسئلہ نہیں چھیڑا۔ علم غیب کے مسئلے میں میں نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ بات دونوں طرف کی صحیح ہے‘ صرف تعبیر کا فرق ہے۔ میری ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ میرا تشخص صرف مسلمان کی حیثیت سے نمایاں ہو‘ کیوں کہ مجھے دعوت پیش کرنی ہے اقامتِ دین کی‘ غلبۂ اسلام کی اور انقلابِ اسلامی کی۔ جس کا حکم قرآن میں بایں الفاظ دیا گیا ہے:

﴿فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَاۤ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ﴾ (الشوریٰ:۱۵)

’’پس (اے نبی ﷺ!) آپ اسی (دین) کی دعوت دیتے رہیے‘ اور جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے مضبوطی سے قائم رہیے‘ اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کیجیے‘ اور ان سے کہہ دیجیے کہ میں تو اس کتاب پر ایمان لایا ہوں جو اللہ نے نازل کی ہے‘ اور مجھے حکم ہوا ہے کہ تمہارے درمیان عدل قائم کروں۔‘‘

ہم کسی کے دباؤ میں آ کر کسی کی خواہشات کی پیروی نہیں کریں گے۔ دلیل سے ہماری رائے بدلی جا سکتی ہے۔ میں کبھی یہ نہیں کہتا کہ میری رائے میں غلطی کا امکان نہیں۔ کوئی دلیل سے

میری غلطی واضح کر دے تو سر تسلیم خم کروں گا۔ لیکن طاقت کی دلیل سے یہ گردن نہیں جھکے گی۔ یہ گردن کٹ تو سکتی ہے، طاقت کی دلیل سے جھک نہیں سکتی۔

اے اہلِ لاہور! میں آج آپ سے پوچھتا ہوں کیا میں تیس برس سے آپ کے سامنے کتاب اللہ کا پیغام پیش نہیں کر رہا ہوں؟ میرا سارا کام، میری ساری دعوت قرآن کے حوالے سے ہے۔ میں حدیثِ رسول کا منکر نہیں ہوں، نہ اس کی اہمیت کو کم سمجھتا ہوں، لیکن میں نے اپنا اصل موضوع اُسے نہیں بنایا، اصل موضوع اللہ کی کتاب کو بنایا ہے۔ اس کتاب پر ایمان کا تقاضا ہے کہ ہم عدل کریں۔ جو بات کہیں وہ عدل پر مبنی ہو۔ ہمیں عدل کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر زیادتی کی گئی ہے تو اُس زیادتی کو زیادتی کہا جائے گا، چاہے وہ آج کا کوئی فرعون یا آج کا کوئی ہامان کر رہا ہو۔ خواہ مذہبی فرقوں کی طرف سے زیادتی ہو رہی ہو یا سیاسی جماعتوں کی طرف سے زیادتی ہو رہی ہو۔ ہم سچ کو سچ کہیں گے اور جھوٹ کو جھوٹ۔ میں بھی آج اُسی طرح گزارش کر رہا ہوں جیسے خلق قرآن کے مسئلہ پر امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا تو آپؒ ہر کوڑے پر یہ فرماتے تھے: اعطونی شیئًا مِن کتاب اللّٰہِ او سُنّۃِ رَسُولِہٖ حَتّٰی اَقُولَ بِہٖ ''میرے سامنے کوئی دلیل اللہ کی کتاب سے یا اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سُنّت سے لے آؤ تو میں مان لوں گا''۔ لیکن کتاب وسُنّت کی دلیل کے بغیر احمدؒ بن حنبل ہرگز نہیں مانے گا چاہے اس کی چمڑی ادھڑ جائے، چاہے اُس کے جسم کے ٹکڑے اڑا دیے جائیں۔ ہم بہت کمزور ہیں، لیکن دل میں اُنہی کے نقش قدم پر چلنے کی آرزو ہے۔ اُنہی کے راستے کو ہم نے اپنا راستہ سمجھا ہے۔ یہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا راستہ ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا راستہ ہے، ائمہ اور محدثین کا راستہ ہے، ہمارے صلحاء اور صوفیاء کا راستہ ہے۔ کیا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جیل میں نہیں ڈالے گئے؟ کیا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے کندھے نہیں اکھڑوا دیے گئے؟ کیا احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کو قید نہیں کیا گیا؟ کیا احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو کوڑے نہیں پڑے؟ یہ سب کچھ ہوتا رہا ہے۔ یہ تو اس باغ کے پھول ہیں، یہ اس راہ کے سنگ میل ہیں۔ یہ تو ہماری ہمتوں کو بڑھانے اور ہمارے ارادوں کو بلند کرنے والی مثالیں ہیں۔

آخری گزارش یہ ہے کہ گزشتہ دنوں میں مجھے بے حساب گالیاں دی گئیں۔ یہاں تک کہ میرے بزرگوں کو گالیاں دی گئیں۔ میں واقعتاً آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ میری طرف سے کوئی جواب نہ دیجیے۔ اس طرح تو آپ میرے اجر وثواب کو کم کر دیں گے۔ ان گالیوں سے اللہ تعالیٰ کے ہاں نہ معلوم میری اور میرے بزرگوں کی کتنی خطاؤں کا کفّارہ ہو گیا ہے۔ البتہ ہر وقت دلیل سے سمجھنے اور سمجھانے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ کسی سے لڑنے جھگڑنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ امن وامان کو بہرصورت برقرار رکھیں، کہیں کوئی غلط اقدام نہ کیجیے۔ ہم تو اُس راستے پر چلنے کا عزم رکھتے ہیں جس پر چلتے ہوئے بارہ برس تک محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب کو حکم تھا کہ تمہارے ساتھ کچھ بھی کیا جائے تم ہاتھ نہ اٹھاؤ! ہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہیں۔ ہم حضرت ہابیل کے نقش قدم پر چلنے والے ہیں۔ حضرتِ حسین رضی اللہ عنہ کا اسوہ بھی ہمارے لیے اسوہ ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہمیں اپنے دفاع میں ہاتھ اٹھانا پڑے۔ لیکن موجودہ حالات کے حوالے سے میں قرآن کے الفاظ میں اعلان کر رہا ہوں کہ ان جھگڑوں کا فیصلہ تو اس احکم الحاکمین کی عدالت میں ہوگا۔ آپ بہرصورت اپنے جذبات کو قابو میں رکھیں۔

﴿اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۭ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۭ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝۱۵﴾ (الشوریٰ)

''اللہ ہی ہمارا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں۔ ہمارے اور تمہارے درمیان کسی حجت بازی کی ضرورت نہیں۔ اللہ (ایک روز) ہم سب کو جمع کر دے گا، اور اُسی کی طرف سب کو لوٹنا ہے۔''

مجھے قتل کی جتنی دھمکیاں ملی ہیں اور میرے قتل کی جتنی افواہیں اڑی ہیں وہ آپ کے علم میں ہیں۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گا کہ اگر ایسا ہو جائے تو اس سے بڑی سعادت کیا ہے۔ اگر کوئی فتنہ پرور سازشی میری ساری خطاؤں کا ذمہ لیتا ہے تو میرے لیے یہ گھاٹے کا سودا نہیں۔ اگر کسی ادنیٰ درجے میں بھی آخرت کا یقین ہے تو اس سے زیادہ نفع کا

سودا اور کوئی نہیں۔ میں اس کے لیے تیار ہوں۔ لیکن پھر میری یہی گزارش ہے کہ اس پر کسی درجے میں کوئی اشتعال نہیں ہونا چاہیے۔ زبان تک استعمال نہ کیجیے۔ جو ہوگا میرے ساتھ ہوگا اور یہ میرے لیے بڑی سعادت ہوگی۔ قرآن کا فرمان شہداء کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ:

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۱۵۴﴾ (البقرة)

”اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں انہیں مردہ نہ کہو۔ ایسے لوگ تو حقیقت میں زندہ ہیں مگر تمہیں (ان کی زندگی کا) شعور نہیں ہوتا۔“

اور حضور ﷺ کی آرزوئے شہادت کتنی اثر انگیز ہے:

((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَوَدِدْتُ اَنِّیْ اُقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ اُحْیَا، ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیَا ، ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیَا، ثُمَّ اُقْتَلُ)) (صحیح البخاری‘ کتاب الجھاد‘ باب تمنی الشھادة)

”قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے‘ میری انتہائی آرزو ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں‘ پھر زندہ کیا جاؤں‘ پھر قتل کیا جاؤں‘ پھر زندہ کیا جاؤں‘ پھر قتل کیا جاؤں‘ پھر زندہ کیا جاؤں‘ پھر قتل کیا جاؤں۔“

حضرت عمر فاروق ؓ کی دعا بھی صحیح بخاری میں منقول ہے۔ کتاب فضائل مدینہ (باب ۱۲) میں حضرت زید ؓ اور اُمّ المؤمنین حضرت حفصہ ؓ کی روایت درج ہے کہ خلیفہ ثانی امیر المؤمنین عمر فاروق ؓ اپنے رب کے حضور عرض کیا کرتے تھے:

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ شَھَادَۃً فِیْ سَبِیْلِکَ‘ وَاجْعَلْ مَوْتِیْ بِبَلَدِ رَسُوْلِکَ ﷺ

”اے اللہ مجھے اپنے دین کی راہ میں شہادت عطا کر اور میری موت تیرے رسول ﷺ کے شہر میں ہو۔“

حضرت عمر فاروق ؓ کی دعا کے آخری حصے کا پس منظر بھی سمجھ لیجیے۔ ایک مرحلے پر ایران کے جہاد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تو حضرت عمر ؓ نے خود محاذِ جنگ پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس موقع پر حضرت علی ؓ نے انہیں روکا۔ اس وقت حضرت عمر ؓ کے دست راست حضرت

علی ؓ ہی تھے۔ حکومت کا پورا نظام‘ پورا سیکرٹیریٹ حضرت علی ؓ کے حوالے تھا۔ حضرت عمر ؓ کا مشہور قول ہے: لَوْلَا عَلِیٌّ لَھَلَکَ عُمَرُ کہ ”اگر علی ؓ نہ ہوتے تو عمر ؓ ہلاک ہو گیا ہوتا!“ اس لیے کہ حضرت عمر ؓ کے عہد خلافت میں حکومتِ اسلامیہ کی حدود اس تیزی سے پھیل رہی تھیں کہ اگر اس کی پشت پر وہ انتظامات نہ ہوتے جو حضرت علی ؓ نے کیے تو تباہی ہو جاتی۔ حضرت علی ؓ حضرت عمر ؓ کی حکومت کے بہت اہم رکن تھے۔ حضرت عمر ؓ کے سفر ایران کے ارادے پر حضرت علی ؓ نے فرمایا تھا کہ چکی اسی وقت تک چلتی ہے جب تک اس کا دُھرا اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔ آپ کی حیثیت اس وقت اس اُمت کے اور عالمِ اسلام کے دُھرے کی سی ہے۔ آپ اپنی جگہ سے ہل گئے تو عالمِ اسلام کی چکی کیسے چلے گی؟ اس پس منظر میں دیکھئے کہ حضرت عمر ؓ شہادت بھی مانگ رہے ہیں لیکن مدینۃ النبی ﷺ میں مانگ رہے ہیں۔ اور اللہ نے ان کی یہ آرزو پوری فرما دی۔ تو کیا اس میں حضرت عمر ؓ کا کوئی گھاٹا ہوا؟ انہیں تو زندگی کی تمنا ہی نہیں تھی۔ جس کا ایمان آخرت پر ہو وہ زندگی کی تمنا کبھی کر ہی نہیں سکتا۔ قرآن یہود سے یہی تو کہتا ہے اگر تمہیں خیال ہے کہ تم اللہ کے چہیتے ہو اور آخرت کا اجر تمہارے لیے محفوظ ہے تو موت کی تمنّا کرو!

﴿قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۹۴﴾ (البقرة)

”ان سے کہو اگر واقعی اللہ کے نزدیک آخرت کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے لیے مخصوص ہے تب تو تمہیں چاہیے کہ تم موت کی تمنا کرو اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو۔“

لہٰذا میرے لیے تو ان دھمکیوں میں نوید جانفزا ہے۔ لیکن ایک بات میں سمجھا دینا چاہتا ہوں‘ ہر شخص کو‘ ہر سازشی کو‘ خواہ وہ کسی اندرونی طاقت کا آلہ کار ہو یا بیرونی قوت کا‘ ہر شخص جان لے کہ ڈاکٹر اسرار اب کسی فرد کا نام نہیں ہے‘ ایک فکر کا عنوان بن چکا ہے‘ ایک تحریک کی علامت بن چکا ہے۔ وہ تحریک اقامت دین کی تحریک ہے‘ کوئی فرقہ وارانہ تحریک نہیں ہے۔ اسی دور کی مثال دیکھ لیجیے‘ شاہ ایران نے ڈاکٹر علی شریعتی کو قتل کروا دیا تو کیا ان کی فکر

بھی ختم ہوگئی تھی؟ انقلابِ ایران کو عظیم قیادت تو بہرحال آیت اللہ خمینی کی صورت میں ملی‘ لیکن اس کی پشت پر جو فکر تھا وہ ڈاکٹر علی شریعتی کا تھا۔ وہ ان کی کتابیں تھیں اور ان کا فکر تھا جس نے لوگوں کے اندر آگ بھر دی تھی۔

فکر کبھی نہیں مرتا۔ جو انقلابی فکر کتاب اللہ کے حوالے سے اس پاکستان میں گزشتہ تیس برس سے پھیل رہا ہے اور آج لاکھوں کیسٹوں کی صورت میں ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے‘ وہ ان شاء اللہ اپنے نتائج ظاہر کرے گا۔ وہ میرا فکر نہیں ہے‘ وہ اللہ کی کتاب کا پیغام ہے‘ اللہ کے رسول ﷺ کا پیغام ہے۔ آپ سے صرف اتنی گزارش ہے کہ ہر شخص اپنے فرض کو پہچانے‘ اس فکر کو پھیلائے‘ اقامتِ دین کی تیاری کرے۔ اپنی قوتوں کو دوسری باتوں میں ضائع کرنے کی بجائے ہمیں اپنا پورا وقت اور پوری صلاحیتیں قرآن کی اس دعوت کو پھیلانے پر صرف کرنی ہیں اور ایک ایسی جمعیت تیار کرنی ہے جو اس قرآن کے انقلاب کے لیے تن من دھن لگانے کے لیے تیار ہو۔ ہمیں اپنے اسی مثبت کام سے کام رکھنا ہے۔ ان وقتی خرخشوں اور جھگڑوں کی طرف متوجہ ہونے کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ہم نے اغیار کی سازشوں کو خود برگ و بار لانے کا موقع دے دیا ہے۔

اقول قولی ھٰذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات○○

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے دو فکر انگیز خطابات پر مشتمل کتابچہ

توبہ کی عظمت اور تاثیر

اور موجودہ حالات میں کرنے کا اصل کام

اشاعتِ خاص: 65 روپے　　اشاعتِ عام: 35 روپے

قرآن مجید سے زندہ تعلق
ماضی، حال، مستقبل

حافظ شفیق احمد☆

اللہ کریم نے انسانِ اوّل حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا، انہیں مسجودِ ملائک بنایا، پھر آزمائش کے لیے انہیں جنّت میں رکھا۔ جنّت میں شیطان نے ان کو بہکایا اور انہوں نے غلطی سے درخت کا پھل کھالیا۔ پشیمان ہوئے، توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی توبہ قبول کر لی۔ اس کے بعد اللہ کریم نے ان کو اور شیطان کو زمین پر اتار دیا۔ جب آدم علیہ السلام زمین پر اتارے جانے لگے تو اللہ جل شانہ نے ان کو تسلی دی کہ دنیا میں کیونکہ انہیں خلیفہ بنایا گیا ہے اور انہوں نے اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی زمین پر کرنی ہے، لہٰذا زندگی کے مختلف مراحل کے لیے ہدایت اللہ کریم کی طرف سے آئے گی اور ساتھ ہی ساتھ بتا دیا گیا کہ اس ہدایت پر عمل کرنے والوں کو انعام سے نوازا جائے گا اور عمل نہ کرنے والوں کو بُرا انجام دیکھنا ہوگا۔

فرمایا: ﴿ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ ﴾ ''ہم نے کہا: تم سب کے سب یہاں سے اُتر جاؤ۔'' ﴿فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٣٨﴾ ''تو جب بھی آئے تمہارے پاس میری جانب سے کوئی ہدایت، تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ حزن سے دوچار ہوں گے۔'' ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ ''اور جو کفر کریں گے'' ہماری اس ہدایت کو قبول کرنے سے انکار کریں گے، ناشکری کریں گے۔ ﴿وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ﴾ ''اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے'' ﴿اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٣٩﴾ (البقرۃ) ''وہ آگ والے (جہنمی) ہوں گے، اس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔''

☆ معاون شعبہ تربیت، دارالاسلام مرکز تنظیم اسلامی لاہور

اب چونکہ اللہ جلّ شانہ کی طرف سے جو ہدایت آتی اُسے وصول کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی، صرف انبیاء و رسل علیہم السلام ہی اسے وصول کر سکتے تھے، لہٰذا آدم علیہ السلام کو پہلا نبی بھی بنایا گیا تاکہ اللہ ربّ العالمین کی اُس ہدایت کو جو انسانی زندگی کے لیے ضروری ہے وصول کر سکیں اور اس پر عمل کر کے ابدی فلاح حاصل کر سکیں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے زندگی گزارنے کے لیے یہ ہدایات وقتاً فوقتاً آتی رہیں اور خوش نصیب انسان اس سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ اللہ کریم کی طرف سے یہ سلسلہ چلتا رہا اور بالآخر یہ ابتدائی ہدایت ''الہدیٰ'' کی شکل میں نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مکمل ہوگئی اور اب تا قیامِ قیامت انسانی زندگی کے لیے ایک ایسا معیار بن گئی کہ جس کے تحت اگر زندگی بسر کی جائے گی تو دنیا بھی آرام سے گزرے گی اور آخرت بھی سنور جائے گی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی ہدایت (یعنی قرآن مجید) کو اپنی دعوت و تبلیغ اور انذار و تبشیر کی بنیاد بنایا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرمایا: ﴿ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿٥٢﴾ (الفرقان) ''اور آپؐ ان (کُفّار) سے جہاد کیجیے اس (قرآن) کے ذریعے بہت بڑا جہاد''۔ ان تعلیمات کے پیشِ نظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دن رات محنت فرمائی اور ایک مضبوط جماعت تیار کی، جس جماعت کی تعلیم، تربیت اور تزکیہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود فرمایا۔ اس جماعت کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ان کا ایک زندہ تعلق قرآن مجید کے ساتھ تھا۔ وہ اسی کی دعوت دیتے تھے، اسی کو رات اور دن میں پڑھتے تھے۔ ان حضرات کا عمومی معمول یہ تھا کہ روزانہ ایک منزل پڑھ کر ہفتہ واری اس کا دَور مکمل کر لیا کرتے تھے، ان میں سے بعض تین دن میں بھی پڑھتے تھے اور بعض روزانہ ایک قرآن مجید کا دور کر لیتے تھے۔

ان اصحاب کا قرآن مجید سے یہ تعلق اتنا گہرا تھا کہ اپنوں کی نہیں دشمنوں کی، اور عام آدمیوں کی نہیں جاسوسوں کی رپورٹ تھی کہ '' هم رهبان بالليل وفرسان بالنهار ''یعنی یہ قیام اللیل ان سے میدانِ جنگ میں بھی نہ چھوٹتا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اپنے معمولات بھی اور دیگر کبارِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے معمولات بھی قرآن مجید کی کثرتِ تلاوت کے تھے۔ اسی طرح جو بھی ایمان لاتا وہ اسی رنگ میں رنگا جاتا۔

نبی اکرم ﷺ کا قرآن کریم سے شغف

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''قرآنِ حکیم کے اصل مقام و مرتبہ کا علم تو صرف اُس شاہِ ارض و سماوات کو ہے جس کا یہ کلام ہے اور اس کی حقیقی قدر و قیمت سے آگاہ صرف وہ ذاتِ بابرکات ہے جس پر یہ نازل ہوا' یعنی نبی کریم ﷺ۔''

قرآن مجید سے نبی کریم ﷺ کا کیا تعلق تھا' چند واقعات دیکھتے ہیں۔

شمائل ترمذی کی روایت کا مفہوم ہے کہ ''جب نبی کریم ﷺ نماز میں قرآن مجید پڑھتے تو آپؐ کے سینۂ مبارک سے ایسی آواز آتی جیسی ہنڈیا کے اُبال کی آواز ہوتی ہے''۔ اس کی تشریح میں اہلِ علم فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کے دلوں میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا خوف ہوتا ہے اور وہ گناہوں کی گندگی سے پاک صاف ہوتے ہیں وہ جب قرآن مجید پڑھتے ہیں تو ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں' ان کے دل کانپ جاتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔ کائنات میں نبی کریم ﷺ کے قلب مبارک سے زیادہ کس کا دل خشیت الٰہی سے معمور ہو سکتا ہے؟ اس لیے آپ ﷺ جب نماز میں تلاوت فرماتے تھے تو اندرونی سوزش اور درد کی وجہ سے آپؐ پر گریہ وبُکا کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

نبی کریم ﷺ تہجد میں بعض اوقات قرآن مجید کی اس قدر تلاوت فرماتے جو چھ پاروں سے بھی زائد بنتی ہے۔ آپ ﷺ کی پنڈلیاں مبارکہ متورم ہو جاتیں' لیکن آپؐ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے ان معمولات کو جاری رکھتے۔ واضح رہے کہ نبیٔ رحمت ﷺ کی تلاوت اتنے آرام و سکون سے ہوتی تھی کہ اگر کوئی لکھنا چاہتا تو آرام سے لکھ لیتا۔ اور یہ لکھنا بھی ہمارے آج کی طرح کا لکھنا نہ تھا کہ تیز رفتاری سے لکھنے کے لیے بہت رواں پین اور کاغذ موجود ہیں' بلکہ یہ لکھنا قلم کو دوات میں ڈبو کر سخت قسم کے کاغذ یا چھال یا ہڈی پر لکھنا تھا۔ اندازہ لگائیے کہ اس طرح لکھنے میں کتنی دیر اور کیسی کچھ مشقت ہوتی ہوگی اور پھر سمجھئے کہ نبی کریم ﷺ کتنے آرام سے تلاوت فرماتے تھے۔

نبی کریم ﷺ پر قرآن مجید نازل ہوا تھا اور آپؐ اس کی خوب تلاوت بھی فرمایا کرتے تھے' لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ کو دوسروں کی زبان سے بھی تلاوتِ قرآن مجید سننے کا شوق تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک بار مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ! میں نے عرض کیا کہ میں آپؐ کو پڑھ کر سناؤں؟ جبکہ یہ آپؐ پر ہی نازل ہوا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں دوسرے سے اس کو سنوں۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے سورۃ النساء پڑھنا شروع کی' حتیٰ کہ جب میں اس آیت پر پہنچا:

﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۝۴۱﴾

''اُس وقت کیا منظر ہوگا جب ہم ہر اُمّت سے ایک گواہ لائیں گے اور ان سب پر (اے نبی ﷺ) آپ کو گواہ بنائیں گے'' تو اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ بس کر دو! مَیں نے آپ ﷺ کی طرف دیکھا تو آپؐ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

اس حدیث کی شرح میں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

البكاء عند قراء ة القرآن صفة العارفين وشعار الصالحين

''قرآن مجید کی تلاوت کے وقت رونا عارفین کی صفت اور صالحین کا شعار ہے۔''

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن پڑھتے اور سنتے ہوئے رونے کو مستحب کہا ہے۔ ظاہر ہے کہ تلاوت سے رونا تب ہی آئے گا جب قرآنی آیات اور الفاظ میں غور و تدبّر کرتے ہوئے تلاوت کی جائے۔ اور حضور ﷺ کی تلاوت غور و تدبّر کے ساتھ ہوتی تھی۔ احادیث میں آپ ﷺ کی تلاوت کا جو حال بیان کیا گیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر آپ ﷺ ایسی آیات پڑھتے جن میں جہنم اور اس کے عذاب یا احوالِ قیامت کا ذکر ہوتا تھا تو آپؐ اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتے تھے اور اگر ایسی آیات پڑھتے جن میں جنّت' اُس کی نعمتوں اور روزِ حساب کی آسانیوں کا ذکر ہوتا تو آپؐ اس کے حصول کی دعا فرماتے تھے۔

سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے احوالِ تلاوت

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کے صحن میں مسجد بنالی تھی (گھر کی مسجد کی دلیل) اس میں آپ نفل نماز ادا کرتے اور قرآن مجید کی تلاوت کرتے۔ قرآن سن کر مشرکین کی عورتیں اور بچے آپؓ پر ہجوم کر لیتے۔ آپؓ کی تلاوت سے محظوظ ہوتے اور آپ کی طرف دیکھنے لگتے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بہت گریہ کرنے والے انسان تھے' تلاوتِ قرآن کے وقت آپ کو اپنی آنکھوں پر قابو نہ رہتا۔ اس بات نے قریش کے سرداروں کو فکر اور تشویش میں مبتلا کر دیا کہ کہیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تلاوت اور گریہ وبکا کو سن کر ان کی بیوی اور بچے مسلمان نہ ہو جائیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نماز اور تلاوت ایسی ہوتی تھی کہ ان کے خشوع وخضوع اور خوف وخشیت کو دیکھ کر بڑے بڑے سنگ دل لوگوں کے دل بھی نرم پڑ جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں پر صحابہؓ کی تقریروں سے زیادہ ان کی عبادات' اخلاق اور معاملات کا اثر ہوتا تھا۔

سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے احوالِ تلاوت

عبداللہ بن شداد رحمہ اللہ فرماتے ہیں' مَیں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں نمازِ فجر ادا کی' سورۂ یوسف پڑھتے ہوئے جب آپؓ اس آیت پر پہنچے: ﴿اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ﴾ (مَیں اپنے رنج وغم کی شکایت بس اللہ ہی سے کرتا ہوں) تو روتے روتے آپ کی ہچکیاں بندھ گئیں' مَیں آخری صفوں میں کھڑا آپ کی ہچکیاں سنتا رہا۔

تلاوت کے وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے رونے بلکہ شدّتِ احساس کی وجہ سے بیمار پڑ جانے کے کئی واقعات حدیث اور سِیَر کی کتابوں میں منقول ہیں۔ حسن بصریؒ بیان فرماتے ہیں کہ بسا اوقات قرآن پڑھتے ہوئے آپ کسی آیت پر گزرتے تو اس قدر خوف اور گریہ آپ پر طاری ہو جاتا کہ زمین پر گر پڑتے اور دو دو دن صاحبِ فراش رہتے' لوگ آپ کو بیمار سمجھ کر عیادت اور بیمار پرسی کے لیے حاضر ہوتے۔

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو دوسروں سے بھی تلاوت سننے کا شوق تھا' چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جو بہت خوش الحان قاری تھے' آپ انہیں یہ کہہ کر قرآن پڑھنے کی فرمائش کرتے ''ذَكِّرْنَا رَبَّنَا ہمیں اپنے رب کی یاد دلایئے''۔ ''شَوِّقْنَا اِلٰى رَبِّنَا ہمیں اپنے رب کی طرف شوق دلایئے'' اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ تلاوت فرما کر ان کی فرمائش پوری کر دیتے۔

قرآن کریم کی تلاوت واقعی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا شوق اور یاد پیدا کر دیتی تھی۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا' وہ اللہ کے کلام کو دنیا کے فانی محبوبوں کے کلام سے کہیں زیادہ وقعت اور توجّہ کے ساتھ سنتے تھے' اس کی ہر آیت بلکہ ہر لفظ کے مفہوم پر نظر رکھتے تھے اور بغیر سمجھے ہوئے تلاوت نہیں کرتے تھے۔ تلاوت تو کیا وہ اگلی آیت اُس وقت تک نہیں سیکھتے تھے جب تک کہ پہلی آیت سے متعلق تمام علوم نہیں سیکھ لیتے تھے۔

ایسی ہی سچی اور گہری تعلیم کا نتیجہ تھا کہ یاد کر لینے کے بعد قرآن اُن کے رگ وپے میں سرایت کر جاتا تھا اور جب وہ قرآن پڑھتے یا سنتے تھے تو ان کے دل کے تار حرکت میں آ جاتے

تھے۔ اگرچہ بغیر سمجھے بوجھے قرآنی اَلفاظ صرف زبان سے ادا کرنا بھی اجر وثواب سے خالی نہیں' لیکن اس میں وہ تاثیر' برکت اور ایمانی کیفیات کہاں جو کتابِ مقدس کے معانی اور مطالب پر نظر رکھتے ہوئے تلاوت کرنے والے کو حاصل ہوتی ہیں۔

سیّدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے احوالِ تلاوت

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ تلاوتِ قرآن مجید کا بے حد اہتمام فرماتے تھے اور پھر بھی سیر نہیں ہوتے تھے۔ اور سیر بھی کیسے ہوتے' تلاوت ان کی روح کی غذا بن چکی تھی۔ حضرت حسن بصریؒ راوی ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: ''اگر ہمارے دل پاک ہوں تو اپنے پروردگار کے کلام سے ہمیں کبھی بھی سیری نہ ہو' اور مجھے یہ بات ناگوار ہے کہ میری زندگی میں کوئی ایسا دن گزرے جس میں مَیں دیکھ کر قرآن مجید کی تلاوت نہ کروں۔''

جب باغی دیوار پھلانگ کر آپؓ کے گھر میں داخل ہوئے تو اُس وقت بھی آپ قرآن مجید کی تلاوت فرما رہے تھے۔ آپ کی زوجہ محترمہؓ نے باغیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ یہ وہ عظیم الشان انسان ہیں جو ایک رکعت میں پورا قرآن ختم کر لیتے ہیں' کیا تمہیں زیب دیتا ہے کہ ایسی بزرگ ہستی کی جان لو؟ قرآن مجید کا وہ نسخہ جس میں آپ تلاوت کیا کرتے تھے وہ کثرتِ تلاوت کی وجہ سے بوسیدہ ہو چکا تھا۔ شہادت کے وقت یہی نسخہ آپ کے سامنے کھلا رکھا تھا۔ جب ظالم دشمن نے آپ پر وار کیا تو خون کا پہلا قطرہ اس آیت پر گرا: ﴿فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿١٣٧﴾﴾ (البقرۃ)

قرآن پاک کا حافظ ہونے کے باوجود حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا مصحف کو دیکھ کر تلاوت کا شوق اس لیے تھا کہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کو چھونے اور دیکھنے کا ثواب بھی حاصل ہو۔ یوں بھی دیکھ کر پڑھنے سے توجّہ اور انہماک زیادہ ہوتا ہے اور خیال اِدھر اُدھر بھٹکنے سے محفوظ رہتا ہے۔

سیّدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم

سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے نماز میں کھڑے ہو کر کلام پاک پڑھا اُس کو ہر حرف پر سو نیکیاں ملیں گی اور جس شخص نے نماز میں بیٹھ کر پڑھا اُس کے لیے پچاس نیکیاں ہیں۔ جس نے بغیر نماز کے وضو کے ساتھ پڑھا اُس کے لیے پچیس نیکیاں اور جس نے بلا وضو پڑھا

اُس کے لیے دس نیکیاں ہیں۔اور جو شخص پڑھے نہیں بلکہ صرف پڑھنے والے کی طرف کان لگا کر سنے اُس کے لیے بھی ہر حرف کے بدلے ایک نیکی ہے۔ سیدنا علی المرتضی رضی اللہ عنہ کی رات کا اکثر حصّہ قیام وسجود اور دعا میں بسر ہوتا تھا۔نوافل میں آپ کثرت سے قرآنِ مجید کی تلاوت فرماتے تھے۔

زمانۂ حال کی ایک جھلک

آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور کبارِ صحابہؓ میں سے چند ایک کے معمولاتِ تلاوت پڑھے۔ یہی معمولات تابعینؒ وتبع تابعینؒ کے بھی رہے‘ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ زوال آنا شروع ہوا۔ اگر ہم آج کا جائزہ لیں تو قرآن مجید سے زندہ تعلق کے حوالے سے عمومی طور پر مسلمانوں کی حالت کافی کمزور ہے۔اس کے مختلف اسباب ہیں‘ جن کا تذکرہ اصلاح کی نیت سے کرتے ہیں‘ تاکہ ہم سب اپنی اپنی اصلاح کر سکیں اور واپس اپنی اصل پر آسکیں۔

آج بہت سے مسلمان تو ایسے ہیں کہ جن کو قرآن مجید پڑھنا بھی نہیں آتا اور اس سے بھی بڑھ کر انہیں اس کا کوئی احساس بھی نہیں ہے کہ وہ کتنی بڑی نعمت سے محروم ہیں۔ اور یہ بات داعیانِ دین کے لیے بڑی فکر مندی کی ہے۔ بہت سے مسلمان ایسے بھی ہیں جو قرآن مجید پڑھے ہوئے ہیں‘ لیکن اس کو معمول بنا کر نہیں پڑھتے اور صرف چند سورتوں کے روزانہ پڑھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔اب تلاوتِ قرآن مجید کے حوالے سے ہفتہ واری دَور تو چھوڑیئے‘ پڑھنے والوں کا معمول سالانہ ہوگیا ہے‘ یعنی رمضان المبارک میں کوشش کر کے ایک ختم کر لینا یا اگر اعتکاف کی توفیق ملے تو کچھ زیادہ ختم کر لینا‘ ورنہ عمومی طور پر ماہانہ یا سہ ماہی وغیرہ ختم کرنے کا معمول بھی قریباً ختم ہوگیا ہے۔

اس حوالے سے بہت سی غلط فہمیاں بھی مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں‘ جن کی اصلاح ضروری ہے اور داعیانِ دین کو اس طرف توجّہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ذیل میں چند وجوہات بیان کی جاتی ہیں جن کی وجہ سے ہماری توجّہ قرآن مجید کی طرف سے ہٹ گئی ہے:

(۱) ان میں سے ایک برکت کا تصوّر بھی ہے‘ یعنی بہت سے افراد یہ سمجھتے ہیں کہ ہم تھوڑا وقت تلاوت کر لیں گے تو برکت حاصل ہوگی۔اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب بڑی بابرکت

ہے‘ لیکن اصلاً تو یہ ہماری روح کی غذا ہے اور انسانی ہدایت کے لیے آئی ہے‘ اسے صرف برکت کے لیے ہی پڑھنا اس کا صحیح استعمال نہیں ہے۔ضرورت ہے کہ مسلسل دعوت کے ذریعے سے اس تصوّر کی اصلاح کی جائے۔

(۲) صرف ثواب کا تصوّر ہونا یعنی اس کی تلاوت سے ثواب ہوگا۔اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ تلاوتِ قرآن مجید پر ثواب کا ملنا خود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتلایا ہے‘ لیکن صرف حصولِ ثواب یا ایصالِ ثواب پر اکتفا کرنا یعنی بغیر سمجھے اسے صرف ثواب کی کتاب سمجھنا قابلِ اصلاح تصوّر ہے۔

(۳) گھروں میں دینی رجحان کا نہ ہونا یعنی قرآن مجید کو کوئی اہمیت نہ دینا۔

(۴) جدید تعلیمی نظام میں قرآن مجید کی اہمیت کو طلبہ کے سامنے واضح نہ کیا جانا کہ جب بغیر قرآن مجید پڑھے ہم دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگری حاصل کر سکتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ قرآن مجید کا تعلیم وتعلّم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۵) خود حفظ کرنے کے بجائے حفظ کروانے پر زیادہ زور دیا جارہا ہے‘ چنانچہ جس چیز کو ہم نے اپنے لیے پسند نہیں کیا اپنی اولادوں کو اس میں ڈالنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

(۶) حافظِ قرآن کا گھروں اور معاشرے میں قابل لحاظ احترام نہ ہونا‘ یعنی اس طرح کی سوچ کہ حفظ کرنا تو کوئی کام نہیں‘ اصل تعلیم تو ایم اے اور ایم فل وغیرہ ہے۔

(۷) سوشل میڈیا کا بے جا استعمال کر کے غور وفکر کی صلاحیت کا دن بدن ختم ہونا‘ جبکہ قرآن مجید ہمیں غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔ جب یہ صلاحیت ہی نہیں رہے گی تو یہ کتاب ہمارے لیے صرف برکت کا ذریعہ ہی رہ جائے گی‘ ہدایت کا ذریعہ نہیں رہے گی۔

(۸) سوشل میڈیا پر وقت کے زیادہ استعمال بلکہ ضیاع کے باعث ہم تلاوتِ قرآن کے لیے مناسب وقت نہیں نکال پاتے۔

(۹) تلاوتِ قرآن مجید کی اہمیت کو نظر انداز کر کے صرف اس پر غور وفکر اور سمجھنے کی دعوت کو عام کرنے کی وجہ سے بہت سے پڑھے لکھے لوگوں کا رجحان زیادہ تر تفاسیر کی طرف ہوجاتا ہے اور عملاً قرآن مجید کی تلاوت کا معمول اور اس سے تذکیر کا پہلو غائب ہوجاتا ہے۔اسی وجہ سے بعض دفعہ یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ سال بھر میں بھی قرآن

مجید مکمل نہیں ہو پاتا۔ یعنی تلاوت قرآن مجید کو مشکل بنا دیا گیا ہے۔

(۱۰) علماء کرام نے بھی قرآن مجید کو اپنی دعوت کا محور نہیں بنایا' یعنی خطابِ جمعہ اور دیگر اجتماعی تقاریر کے مواقع پر قرآن مجید سے تذکیر عموماً نہیں ہوتی۔

(۱۱) قرآن ٹیوشن کا رواج اور ٹیوشن پڑھانے والوں کی جو قدر افزائی عموماً گھروں میں ہوتی ہے وہ بھی قرآن مجید سے دوری کا باعث بن رہی ہے۔

(۱۲) قرآن مجید کے احکام کے مطابق قوانین کے نفاذ کا نظر نہ آنا۔

(۱۳) انفرادی اور اجتماعی معاملات کو طے کرتے ہوئے قرآنی تعلیمات کو نظر انداز کر دینا اور معاشرے میں اس تصوّر کا پیدا ہو جانا کہ' معاذ اللہ' یہ کتاب ہمارے مسائل حل نہیں کر سکتی۔

(۱۴) بڑی بڑی دینی جماعتوں کا ذریعہ دعوت (دعوتی ٹول) قرآن مجید کا نہ ہونا۔

اسی طرح قرآن مجید کے حوالے سے دیگر بہت سے قابل اصلاح تصوّرات ہیں جن کے حوالے سے اس بات سے ڈر لگتا ہے کہ کہیں ہم مہجوری قرآن کی زد میں تو نہیں آ رہے۔ ''مہجوری قرآن'' خود قرآن مجید کی اصطلاح ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ ربّ کریم کی بارگاہ میں عرض کریں گے: ﴿یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝۳۰﴾ (الفرقان) ''اے میرے پروردگار! میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑی ہوئی چیز بنا دیا تھا۔''

ہجر یا ہجران کا لفظی مطلب چھوڑنا' ترک کرنا یا دُور ہونا ہے۔ گویا نبی اکرم ﷺ اللہ کی جناب میں فریاد کرتے ہوئے ان لوگوں کے خلاف شکایت دائر کریں گے جنہوں نے قرآن کے ساتھ ہجر روا رکھا تھا۔

ہجرِ قرآن سے کیا مراد ہے؟

امام منصور ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''ہجرِ قرآن یا ترکِ قرآن سے مراد قرآن پر عمل نہ کرنا' اس سے فائدہ نہ اٹھانا یا اسے فضول شے قرار دینا ہے۔''

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''قرآن پر ایمان نہ لانا' بطورِ کلام اللہ اس کی تصدیق نہ کرنا' قرآن سے تذکیر حاصل نہ کرنا اور اس پر تدبّر نہ کرنا' یا قرآن پر عمل نہ کرنا' اس کے احکام کی پیروی نہ کرنا' اس کے منع کیے گئے امور سے اجتناب نہ کرنا' یا قرآن کو چھوڑتے ہوئے گانے بجانے یا کھیل تماشے میں

مشغول ہونا' یا کسی خلافِ قرآن شعر' قول یا کلام (یعنی فکر و فلسفہ) کی پیروی کرنا' یا اس کے بتائے ہوئے طریق زندگی کے علاوہ کسی اور طریقے کی پیروی کرنا' یہ تمام ترکِ قرآن کی صورتیں ہیں۔''

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ مذکورہ بالا آیت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''تاویلِ خاص کے مطابق حضور ﷺ کی یہ شکایت قریشِ مکّہ کے بارے میں ہے کہ اے میرے پروردگار! میں نے تیرا پیغام ان تک پہنچانے اور انہیں قرآن سنانے کی ہر امکانی کوشش کی ہے' لیکن یہ لوگ کسی طرح اسے سننے اور سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں' جبکہ اس آیت کی تاویلِ عام یہ ہے کہ حضور ﷺ کی یہ شکایت قیامت کے دن اپنی اُمّت کے اُن افراد کے خلاف ہوگی جو اس ''مہجوری'' کے مصداق ہیں' کہ ان لوگوں نے قرآن کو لائقِ التفات ہی نہ سمجھا۔ علامہ اقبال کے اس مصرعے میں اسی آیت کی تلمیح پائی جاتی ہے: ع ''خوار از مہجوریٔ قرآں شدی'' کہ اے مسلمان آج تُو اگر ذلیل و خوار ہے تو اس کا سبب یہی ہے کہ تُو نے قرآن کو چھوڑ دیا ہے۔

اس سلسلے میں ایک بہت اہم اور قابلِ غور نکتہ یہ بھی ہے کہ قریشِ مکّہ نے تو اپنی خاص ضد اور ڈھٹائی میں قرآن کو اس موقف کے تحت ترک کیا تھا کہ یہ اللہ کا کلام ہے ہی نہیں اور محمد (ﷺ) نے خود اپنی طرف سے اسے گھڑ لیا ہے۔ لیکن آج اگر کوئی شخص کہے کہ مَیں قرآن پر ایمان رکھتا ہوں اور اسے اللہ کا کلام مانتا ہوں' مگر عملی طور پر اس کا رویہ ایسا ہو کہ وہ قرآن کو لائقِ اعتناء نہ سمجھے' نہ اسے پڑھنا سیکھے' نہ کبھی اس کے پیغام کو جاننے کی کوشش کرے تو گویا اس کے حال یا عمل نے اس کے ایمان کے دعوے کی تکذیب کر دی۔ چنانچہ اس آیت کے حاشیے (ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ) میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس بارے میں اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں: ''آیت میں اگرچہ مذکور صرف کافروں کا ہے' تاہم قرآن کی تصدیق نہ کرنا' اس میں تدبر نہ کرنا' اُس پر عمل نہ کرنا' اُس کی تلاوت نہ کرنا' اس کی تصحیح قراءت کی طرف توجّہ نہ کرنا' اُس سے اعراض کر کے دوسری لغویات یا حقیر چیزوں کی طرف متوجّہ ہونا' یہ سب صورتیں درجہ بدرجہ ہجرانِ قرآن کے تحت میں داخل ہو سکتی ہیں۔''

(بیان القرآن' حصّہ پنجم' ص ۲۵۱)

مثبت کام

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا قرآن مجید کو بطور ذریعہ دعوت اختیار کرتے ہوئے عوامی دروسِ قرآن مجید' دورۂ ترجمہ قرآن' خلاصہ مضامین قرآن' ایک سالہ رجوع الی

القرآن کورس‘ رفقاء واحباب کے لیے تربیتی کورسز‘ مختلف قرآنی موضوعات پر محاضرات‘ لیکچرز‘ ہر طبقے میں کام کو اٹھانا اور قرآن مجید کی طرف متوجّہ کرنا‘ ایک وسیع ذخیرۂ کتب ولٹریچر‘ کام کو منظّم کرنے کے لیے دو اداروں‘ انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کا قیام اور ان کے ذریعے سے گاؤں دیہات کی سطح پر بھی قرآن مجید کی دعوت کا پہنچنا وغیرہ۔ اس کے نتیجے میں علماء کرام اور دینی اداروں و جماعتوں کا اس طرف متوجّہ ہونا‘ خلاصہ مضامین قرآن مجید کے عنوان سے کئی ایک کتابوں کا منظر عام پر آنا‘ مختصر کورسز کا اجراء‘ جدید تعلیم یافتہ افراد کو فوکس کرتے ہوئے نئے کورسز کا اجراء‘ دروسِ قرآن مجید کے پروگرامات۔ اسی طرح مختلف مکاتب فکر کے مخلص افراد کی طرف سے عربی گرامر‘ تجوید قرآن مجید‘ دروسِ قرآن مجید کا شروع ہونا۔ اب حکومتی سطح پر تعلیمی اداروں میں قرآن مجید کو با ترجمہ پڑھانے کے لیے کوششیں وغیرہ۔

مستقبل میں کرنے کا اصل کام

امام مالکؒ نے سیدنا ابوبکر صدیق ؓ کا قول نقل کیا ہے: لَا یَصْلُحُ آخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلُحَ بِهٖ اَوَّلُهَا ’’اس اُمّت کے آخری حصے کی اصلاح نہیں ہوگی مگر اسی طریق پر جس پر چل کر پہلے حصے کی اصلاح ہوئی‘‘۔ جیسے کہ مضمون کے شروع میں عرض کیا گیا کہ نبی کریم ﷺ نے حکم قرآنی ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۝﴾ پر عمل کرتے ہوئے قرآن مجید کو ہی دعوت وتبلیغ اور تبشیر وانذار کا ذریعہ بناتے ہوئے ایک جماعت تیار کی‘ جن کو قرآن مجید سے بڑا لگاؤ تھا اور انہوں نے اپنی زندگیاں اس کی تعلیمات کے مطابق ڈھال لیں‘ جس کے نتیجے میں اتنی بڑی تبدیلی آئی۔

اب اگر ہمیں بھی اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ غلبہ واقامتِ دین کی مبارک محنت میں حصّہ ڈالنا ہے تو اس کے لیے بہت ضروری ہے کہ ہم قرآن مجید سے ایک زندہ ومضبوط تعلق قائم کریں اور داعیٔ قرآن بنتے ہوئے اُس آنے والے وقت کے لیے تیار ہوں جس کی خبر نبی کریم ﷺ نے دی ہے‘ جس کی رو سے کُل روئے ارضی پر اللہ تعالیٰ کا دین غالب ہوگا۔ اس کے لیے بہت ضروری ہے کہ ہم روزانہ کی بنیاد پر قرآن مجید سے اپنے تعلق کا جائزہ لیں۔

اصل یہ ہے کہ قرآن مجید سے زندہ تعلق ہو‘ یعنی اسے کتابِ ہدایت سمجھتے ہوئے‘ سمجھ کر روزانہ پڑھنا اور کثرت سے پڑھنا‘ جب بھی موقع ملے پڑھنا اور اسے اپنی روح کی اصل غذا

سمجھنا۔ اگر تجوید نہیں آتی تو سیکھیں‘ سیکھی ہوئی ہے تو مزید بہتر کریں۔ قرآن مجید کو زیادہ سے زیادہ یاد کرنے کی کوشش کریں اور جتنا یاد ہوتا جائے اسے اپنا اصل اثاثہ سمجھتے ہوئے مزید کی کوشش کریں۔ اس کے معنی ومفہوم کو سیکھنے کے لیے متوجّہ ہونا‘ روزانہ کی بنیاد پر اس کی گرامر اور الفاظ ومعانی کے اعتبار سے کچھ نہ کچھ حصّہ سیکھنا‘ اسے یاد کرنا‘ اسے اپنی انفرادی نمازوں کے اندر پڑھنا اور اس فکر میں رہنا کہ میں زیادہ سے زیادہ قرآن مجید ایسے پڑھوں کہ جب پڑھ رہا ہوں تو مجھے اس کی سمجھ بھی آ رہی ہو۔ اور کم از کم جو سورتیں ہمارے اپنے محلے کے امام صاحب جہری نمازوں میں پڑھتے ہیں ان کا ترجمہ لازمی سیکھیں‘ تاکہ جب نماز میں ہم قرآن مجید سنیں تو ہمارے اوپر اثر ہو۔

اسی طرح قرآن مجید کا داعی بننے کے حوالے سے ضروری ہے کہ ہم قرآن مجید کے سیکھنے سکھانے کے حوالے سے فضائل کی احادیث یاد کریں‘ اس کی اصولی تعلیمات کو سمجھیں‘ اچھی طرح یاد کریں اور پھر اسے اپنی دعوت کا حصّہ بنائیں۔ دل میں یہ نیت رکھیں کہ ان شاء اللہ ہر مسلمان تک ’’قرآن مجید سمجھ کر ہدایت کی نیت سے روزانہ پڑھنا ہے!‘‘ یہ دعوت پہنچانی ہے‘ غافل مسلمانوں کو متوجّہ کرنا ہے‘ جو پڑھ نہیں سکتے انہیں پڑھنا سیکھنے کی ترغیب دینی ہے اور جو پڑھتے ہیں انہیں روزانہ کی بنیاد پر پڑھنے کی ترغیب دینی ہے۔

اس حوالے سے بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد ؒ کی باتیں دعوتِ فکر وعمل کے لیے پیش خدمت ہیں‘ فرماتے ہیں:

> ’’مقامِ غور ہے کہ آج اگر ہم اپنی دنیا سنوارنے کے لیے انگریزی زبان میں تو مہارت حاصل کر لیں لیکن قرآن کا مفہوم سمجھنے کے لیے عربی زبان کے بنیادی قواعد سیکھنے کی ضرورت تک محسوس نہ کریں‘ تو قرآن پر ہمارے ایمان کے دعوے اور اس کو اللہ کا کلام ماننے کی عملی حیثیت کیا رہ جائے گی؟
>
> چنانچہ ہر مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ قرآن مجید کے حقوق کے بارے میں آگاہی حاصل کرے‘ اس سلسلے میں عملی تقاضوں کو سمجھے اور ان تقاضوں پر عمل کرنے کی حتی المقدور کوشش کرتا رہے۔ اس موضوع پر میرا ایک نہایت جامع کتابچہ ’’مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق‘‘ دستیاب ہے۔ اس کا انگلش‘ عربی‘ فارسی اور ملایا زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ قرآن کے حقوق کا ادراک حاصل کرنے کے لیے اس کتابچے کا مطالعہ ان شاء اللہ بہت مفید ثابت ہوگا۔‘‘

اسی طرح تصوّرِ دین کی وضاحت کے لیے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کی صحیح نوعیت کیا ہے؟ انبیاء ورسل علیہم السلام کے بھیجے جانے کے کیا مقاصد تھے؟ نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت کیا ہے؟ سیرت النبی ﷺ کا مطالعہ‘ انقلاب کے نقطہ نظر سے‘ اسی طرح مختلف موضوعات پر ڈاکٹر صاحب کے آڈیو‘ ویڈیو لیکچرز بھی دستیاب ہیں اور ان کی کتابی صورت بھی۔ قرآن مجید کی مختصر تشریح ’’بیان القرآن‘‘ کے عنوان سے آڈیو‘ ویڈیو اور کتابی شکل میں دستیاب ہے۔

تنظیم اسلامی اور انجمن خدام القرآن کے پلیٹ فارم سے مختلف کورسز کرائے جاتے ہیں‘ مثلاً تجوید کورسز‘ فقہ واصولِ فقہ‘ اصولِ حدیث‘ بنیادی عربی گرامر وغیرہ‘ اسی طرح خط وکتابت اور آن لائن کورسز بھی جاری ہیں (جن کی تفصیلات تنظیم اور انجمن کے دفاتر اور تنظیم اسلامی کی آفیشل ویب سائٹ پر دستیاب ہیں) ان سے استفادہ کرنا بھی بہت مفید ہوگا۔

یہ بات بھی واضح رہے کہ یہ کام پوری اُمّت کے کرنے کا ہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ مسلکوں کی خلیج گہری ہونے کے سبب ہم بہت سے قابل قدر علماء سے اس لیے استفادہ نہیں کرتے کہ وہ ہمارے مسلک اور جماعت کے نہیں ہیں۔ یہ طرزِ عمل بہت غلط ہے‘ آپ جہاں بھی ہیں اور قریب جو بھی صاحبِ علم دستیاب ہیں ان سے فائدہ اٹھائیں۔ اللہ کریم ہم سب کو اس کی توفیق دے۔

یہ بات بھی واضح رہے کہ ہم یہ بات بہت سنتے ہیں کہ علماء اکٹھے نہیں ہوتے‘ دینی جماعتیں کسی بات پر اکٹھی نہیں ہوتیں‘ تو لیجیے بہت سی باتوں کے ساتھ ساتھ اس بات پر تو تمام مسالک کے سب علماء کا اتفاق ہے کہ ہر مسلمان کو قرآن مجید سمجھ کر پڑھنا چاہیے‘ جس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ہر مسلک کے بڑے علماء نے اردو زبان میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ قابل قدر ہستیاں جو اگر چاہتیں تو صرف اپنا مطالعہ عربی زبان میں کرتی رہتیں‘ انہوں نے عربی سے اردو ترجمہ وتفسیر عوام الناس کے مطالعے کے لیے لکھیں۔ بس ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیے اور لوگوں کو متوجّہ کرنا چاہیے۔ اس ضمن میں اپنے لیے ہفتہ وار‘ ماہانہ‘ سہ ماہی اور سالانہ بنیادوں پر ٹارگٹس رکھنے چاہئیں۔

مثال کے طور پر ایک رفیق کا ٹارگٹ یہ ہونا چاہیے کہ میں ان شاء اللہ ایک ماہ میں یا دو ماہ میں پانچ مسلمانوں کو قرآن مجید پڑھنے پر لگا دوں گا اور سہ ماہی ٹارگٹ کہ میں ان شاء اللہ روزانہ قرآن مجید پڑھنے والوں کو سمجھ کر پڑھنے پر لگا دوں گا‘ وغیرہ۔

اسی طرح اپنے بچّوں‘ بچیوں اور گھر میں محرم خواتین کی قرآنی تعلیم اور تربیت کے حوالے سے خیال کرنا‘ مثلاً‘ چھوٹے بچے اور بچیوں کو اچھے قاری صاحب/ قاریہ سے پڑھوانا۔ نماز چونکہ ساری زندگی پڑھنی ہوتی ہے لہٰذا شروع سے خیال کرنا کہ اس کو با ترجمہ یاد کرایا جائے اور بطور خاص سورۃ الفاتحہ کے ساتھ ساتھ چھوٹے بچوں کو لازماً سورۃ الاخلاص اور معوّذتین لفظی ترجمہ سے یاد کرائی جائیں۔ اسی طرح آخری تشہد میں درود شریف کے بعد بچوں کو (اسی طرح جن بڑوں کو یاد نہیں ہیں انہیں بھی) مختلف قرآنی دعائیں یاد کرائی جائیں۔ اس حوالے سے کئی مفید کتابیں موجود ہیں‘ جن میں ’’رَبَّنَا‘‘ کے صیغے سے ساری قرآنی دعائیں جمع کر دی گئی ہیں۔

اللہ کریم ہمیں ان باتوں کی سمجھ اور خلوص سے ان پر عمل کی توفیق دے۔ آمین یا ربّ العالمین!

(قرآن مجید کے حوالے سے یہ چند چیزیں عمل کرنے والوں کی توجّہ کے لیے ہیں۔ اس حوالے سے گزارش ہے کہ کسی بھائی کے ذہن میں جو مزید باتیں ہوں وہ براہِ کرم شعبہ تربیت مرکز تنظیم اسلامی لاہور کو لکھیں۔ جزاکم اللہ خیر!)

﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ﴾ (طٰہٰ:14) ’’اور نماز قائم کرو میری یاد کے لیے!‘‘

فلسفۂ دین کی رُو سے
طالبانِ قرآن اور خادمانِ دین کے لیے

نماز کی خصوصی اہمیّت

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

کے دو (2) فکر انگیز اور بصیرت افروز خطابات

o امپورٹڈ بک پیپر o عمدہ طباعت o خوبصورت ٹائٹل
o صفحات:56 o قیمت:60 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور، 36 کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور، 3-35869501-042

انسانی تاریخ میں اقامتِ دین کا تسلسل
اور
آنے والا غلبۂ اسلام کا دور
(بالخصوص پاکستان اور مَا حَوْلَہٗ کے حوالے سے)

انجینئر محمد رشید عمر

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۸۵﴾ (آل عمران)

''جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی اور نظامِ حیات چاہے گا اُس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا' اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں ہو جائے گا۔''

''جو کوئی'' آدمِ اوّل سے لے کر اس دنیا کے آخری انسان تک کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ایک عرصہ تک ایک ہی دین کی پیروکار رہی: ﴿كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۟﴾ (البقرۃ:۲۱۳) ''لوگ ایک ہی اُمت تھے''۔ تمام کا مطمحِ نظر ایک ہی تھا اور وہ اسلام تھا۔ لیکن جب اختلافات پیدا ہوئے تو ان کو ختم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کو مبعوث فرمایا:

﴿فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۱۳)

''اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو مبشر اور منذر بنا کر بھیجا' اور ان کے ساتھ سچی کتاب نازل کی تاکہ وہ لوگوں میں فیصلہ کریں ان باتوں کا جن میں وہ اختلاف کرتے تھے۔''

ہدایتِ آسمانی کا مقصد یہ تھا کہ نہ صرف ان کے اختلافات کو رفع کیا جائے بلکہ ایک نظامِ حیات

پر ان کو چلایا جائے۔ بفحوائے قرآنی:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ﴾ (الشوریٰ:۱۳)

''اُس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح (علیہ السلام) کو دیا تھا اور جسے (اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اب آپ کی طرف ہم نے وحی کے ذریعے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو دے چکے ہیں اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔''

یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ دین اسلام ہے' جس کا مطلب ہے کہ ہر دور میں ہر حال میں اللہ کی فرمانبرداری کی جائے گی۔ اس دین کے دو حصے ہیں' ایک حصہ عقائد و نظریات اور دوسرا حصہ معاملات کو چلانے کی ہدایات یعنی شریعت۔ عقائد و نظریات غیر متبدل ہیں یعنی توحید' رسالت اور آخرت کے اصول و ضوابط کبھی تبدیل نہیں ہوتے' البتہ شریعتوں میں قوموں کے احوال و ظروف کی نسبت سے جزوی تبدیلیاں کی جاتی رہی ہیں۔ غیر متبدل عقائد و نظریات کے ساتھ جو شریعت بھی دی گئی اس پر آمَنَّا وَصَدَّقْنَا کہہ کر عمل پیرا ہونے کا نام اسلام ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسانوں کی پسندیدہ روش ہے۔ سورۃ الشوریٰ میں پانچ اولوالعزم رسولوں علیہم السلام کا ذکر کر کے کہ ہم نے ان کو اقامتِ دین کا حکم دیا تھا' تمام انبیاءؑ کی تاریخ کا احاطہ کر لیا گیا ہے۔ تمام انبیاءؑ نے اقامتِ دین کے لیے اپنے اپنے دور میں سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ مخالفین نے ان کی تحریک کو ناکام بنانے کے لیے ہر ممکن حربہ استعمال کیا' لیکن انجام کار اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء اور ان کے سچے پیروکاروں کو یہ موقع دیا کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کے نظام کے تحت زندگی گزاریں۔ قرآن مجید کی روشنی میں ہم ان انبیاء کی تحریکوں کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

پہلا بگاڑ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم میں پیدا ہوا۔ جن لوگوں کے ہاتھوں میں قیادت تھی اور جو مال و اولاد کے اعتبار سے نمایاں تھے' انہوں نے شرک اور شرکیہ نظریات پر اعمال کی عمارت تعمیر کر لی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو ان کی اصلاح کے لیے بھیجا۔ انہوں نے ساڑھے نو سو سال انہیں راہِ راست پر لانے کی محنت کی۔ یہاں تک کہ:

﴿قَالُوْا یٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۳۲﴾﴾ (ھود)

''انہوں نے کہا: اے نوح! تم نے ہم سے جھگڑا کیا ہے اور بہت جھگڑا کیا ہے (ہم تمہاری بات نہیں مانیں گے) چنانچہ جس (اللہ کے عذاب) سے تم ہمیں ڈراتے ہو وہ لے آؤ اگر تم سچے ہو۔''

نتیجہ کیا ہوا؟ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام اور آپؑ پر ایمان لانے والوں کی مدد کی اور نہ ماننے والوں کو پانی کے طوفان میں غرق کر دیا:

﴿قِیْلَ یٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَیْكَ وَعَلٰۤی اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ﴾ (ھود:۴۸)

''کہا گیا: اے نوحؑ آپ اتر جایئے (کشتی سے) ہماری طرف سے آپ پر اور جو امتیں آپ کے ساتھ ہیں ان پر سلامتی اور برکتوں کے ساتھ۔''

یہ وہ لوگ تھے جن کی زندگی کفر اور شرک سے پاک تھی۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح ان لوگوں کو سلامتی اور برکات سے نوازا' اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے کس درجہ میں اللہ ربّ العزت کے احکام کے تحت چلنے والے معاشرے کو جنم دیا ہوگا۔

حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو راہِ راست پر لانے کی تحریک کا آغاز کیا۔ ایمان لا کر دین اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کے نتیجے میں انہوں نے اپنی قوم کو جو بشارتیں دیں ان کے دو نکات بڑے نمایاں تھے:

(۱) بارشوں کی وجہ سے زمین سے پھلوں اور اناج کی فراوانی عطا کی جائے گی' یعنی تمہاری معیشت مضبوط کر دی جائے گی۔

(۲) یہ لوگ جسم کے اعتبار سے پہلے سے بڑے قدآور اور قوت والے تھے تو اللہ نے ہود علیہ السلام کے ذریعہ انہیں بشارت دی کہ تمہاری قوت میں اور اضافہ کر دیا جائے گا۔

باوجود ان وعدوں کے' قوم نے مخالفت میں کمی نہیں کی اور ان کی دعوت کو ٹھکرایا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ہود علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو بچا لیا اور بقیہ پوری قوم کو تباہ کر دیا۔ جو بچنے والے تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رحمت سے نوازا اور انہوں نے اپنی زندگی پیغمبر کی قیادت میں دینِ اسلام کے مطابق گزاری۔

قومِ ثمود کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت صالح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ طویل جدّ و جُہد کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی انہوں نے اللہ ربّ العزت کے نظام کے تابع ہونے سے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے قومِ ثمود کو تباہ کر دیا۔ حضرت صالح علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والوں نے یقیناً دین اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کا آغاز کیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے عالمگیر نبی تھے۔ فرات کے کنارے شہر اُر سے نکلے' اپنے بھتیجے ہاران کے بیٹے لوط علیہ السلام کو شرقِ اُردن میں اور اپنے بیٹے اسحاق علیہ السلام کو شام اور فلسطین میں دین متین کے مطابق لوگوں کو زندگی گزارنے کی دعوت کے ساتھ بھیجا۔ اندرونِ عرب میں اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو مکہ میں آباد کیا اور یہیں اللہ کا گھر تعمیر کیا۔

شرقِ اُردن میں سدوم اور عمورہ کے لوگوں کو حضرت لوط علیہ السلام نے بے حیائی و فحاشی کو ترک کر کے پاکیزہ معاشرہ کی تشکیل کی دعوت دی۔ ان کی دعوت کو ٹھکرانے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے جرائم میں ملوث افراد کو چن چن کر پتھروں کی بارش سے ہلاک کر دیا۔ حضرت لوط علیہ السلام اور آپ پر ایمان لانے والوں نے وہاں سے نکل کر ایک ایسا معاشرہ جنم دیا جو بے حیائی' فحاشی اور عریانی سے پاک اعلیٰ معاشرتی اخلاقی اصولوں کا حامل معاشرہ تھا۔ گویا زندگی کے معاشرتی گوشے میں مکمل انقلاب برپا کر دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے اسحاق اور اسماعیل اور اسحاق کے بیٹے یعقوب (علیہم السلام) نے کیسے اسلام پر قائم رہ کر زندگی گزاری' قرآن مجید میں ان کی وصیت سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

﴿وَوَصّٰی بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِیْهِ وَیَعْقُوْبُ ؕ یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی لَكُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾﴾ (البقرۃ)

''اور یہی وصیت کر گیا ابراہیم اپنے بیٹوں کو اور یعقوب بھی کہ اے بیٹو! اللہ نے چن کر دیا ہے تم کو دین (اسلام) سو تم ہرگز نہ مرنا مگر مسلمانی کی حالت میں۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد اور ان کے لواحقین کو دین اسلام کی پوری پہچان تھی اور اس کے مطابق انہوں نے زندگی گزارنے کا اپنے والدین کے ساتھ عہد کیا تھا۔

نظریاتی اور عملی توحید کے نفاذ کا تصوّر کس قدر گہرا اور جامع تھا' یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے قول میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ دین کا یہ جامع تصوّر انہوں نے قید کے ساتھیوں کے سامنے

کس قدر خوبصورتی سے پیش کیا‘ ملاحظہ کیجیے:

۱) ﴿مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ﴾ (یوسف:۳۸)

''ہمارے لیے جائز نہیں کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں۔''

۲) ﴿يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝۳۹﴾ (یوسف)

''اے جیل خانہ کے ساتھیو! متفرق رب بہتر ہیں یا ایک اللہ واحد القہار؟''

بندگیٔ ربّ کے جامع تصوّر کی ایک تشریح ہم بھی کرتے ہیں‘ حضرت یوسفؑ کی زبانی اس کو سنیے:

i) ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ﴾

''حکمرانی کا اختیار صرف اللہ کا ہے۔''

ii) ﴿اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ﴾

''اس نے فرمان جاری کر دیا ہے کہ بندگی صرف اُسی کی ہوگی۔''

iii) ﴿ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ﴾

''یہی پختہ دین (نظامِ زندگی) ہے۔''

iv) ﴿وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۴۰﴾ (یوسف)

''لیکن لوگوں کی اکثریت یہ بات نہیں جان رہی۔''

یہ ایک ہی آیتِ مبارکہ ہے یعنی سورۂ یوسف کی آیت ۴۰ جس کو شق وار درج کیا گیا ہے۔

جس طرح آج سات ارب انسانوں کو اس حقیقت کا ادراک نہیں ہے (الا ماشاء اللہ!) اُس وقت بھی اکثریت دین اسلام کے علم سے نابلد تھی۔ لیکن آلِ یعقوب کے نہ صرف تصوّرات واضح تھے بلکہ وہ عملاً اس کے مطابق زندگی گزار رہے تھے۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر پر حکومت کا موقع ملا تو انہوں نے انہی اصولوں پر ایک اعلیٰ فلاحی نظامِ حکومت چلا کر دکھا دیا‘ جس کی تعریف ایک عرصے بعد آلِ فرعون میں سے ایک بندۂ مومن نے فرعون کے سامنے کی۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ ؕ حَتّٰٓى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا ؕ﴾ (المؤمن:۳۴)

''یقیناً تمہارے پاس یوسف واضح دلائل لے کر آئے تھے لیکن تم اس کے بارے میں شک ہی میں پڑے رہے‘ یہاں تک کہ جب وہ فوت ہو گئے پھر (ان کی قدر و قیمت تم پر آشکار ہوئی) تم کہنے لگے کہ اللہ (ان جیسا) کوئی رسول ان کے بعد نہیں بھیجے گا۔''

حضرت یعقوب علیہ السلام کی زندگی میں حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں نے مصر میں توحیدِ عملی کے مطابق فلاحی نظامِ حکومت قائم کیا اور اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت انہوں نے اپنی اولاد سے اس نظام کے مطابق زندگی گزارنے کا عہد بھی لیا۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

﴿اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝۱۳۳﴾ (البقرۃ)

''کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب پر موت آئی‘ جب اُس نے اپنی اولاد سے کہا: تم کس کی بندگی کرو گے میرے بعد؟ تو وہ بولے: ہم بندگی کریں گے آپ کے رب کی اور آپ کے باپ دادوں یعنی ابراہیم‘ اسماعیل اور اسحٰق کے ربّ کی‘ وہی ایک معبود ہے‘ اور ہم اُسی کے فرمانبردار ہیں۔''

ایسی راسخ العقیدہ اولاد جب مصر کے طاقت کے سرچشموں پر قابض تھے‘ کیا یہ سوچا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے باپ کے ساتھ کیے ہوئے عہد کے خلاف کیا ہوگا؟

اولادِ ابراہیم کی اقامتِ دین کی مزید مساعی کا ذکر کرنے سے پہلے حضرت شعیب علیہ السلام نے معیشت کے میدان میں جس انقلابی جِدّ و جُہد کا کام کیا اس کا ذکر بھی خیر سے خالی نہ ہوگا۔ قومِ شعیب نے مالی منفعتوں کے لیے ہر ناجائز ذریعہ کو اپنے لیے جائز قرار دیا ہوا تھا۔ ان کے علاقے میں لوگوں کے مال اور جانیں محفوظ نہ تھیں۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے انہیں اس روش کو چھوڑ کر اللہ کے قانون کے سامنے سر جھکانے کی دعوت دی لیکن انہوں نے من مرضی کی پیروی کرنے کے علاوہ کسی بھی دوسری بات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں نسیاً منسیا کر دیا۔ ان کے نیست و نابود ہو جانے کے بعد حضرت شعیب علیہ السلام نے دیانت و امانت کے قوانین معیشت کے شعبے میں نافذ کیے اور لوگوں کی جان و مال کے تحفظ کو یقینی بنا دیا۔ گویا معیشت کے ساتھ معاشرت کو بھی اللہ تعالیٰ کے قانون کے تابع کر دیا اور امن عامہ کو بحال کر دیا۔

ہم دوبارہ آلِ یعقوب کے ذکر کی طرف آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی بڑی

تعداد جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آنے والے بڑے بڑے جادوگروں کی آل اولاد بھی شامل تھی' ان کو فرعونیوں کی غلامی سے نجات دلائی اور صحرائے سینا میں لے آئے۔ یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خود اپنی موجودگی میں مرتد ہونے والوں پر اللہ کے قانون کے مطابق قتل کی سزا کا نفاذ کیا۔ بنی اسرائیل ہی میں اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کو منصب خلافت پر فائز کیا' جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق عظیم الشان فلاحی مملکت قائم کی۔ اللہ تعالیٰ نے جنات کو بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کے اختیار میں دے دیا۔ آپؑ پرندوں چرندوں کی بولیاں بھی سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو آپؑ کے معاونین سلطنت کو ایسے علوم اور ٹیکنالوجی سے نوازا تھا کہ وہ بھاری وزن ہزاروں میل سے پلک جھپکنے میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دیتے تھے۔ ان کی ان خوبیوں کی مثال آج تک دنیا پیش نہیں کر سکی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کو اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمنوں پر غلبہ عطا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں ایسے اللہ والے درویش اور امام پیدا کیے جو اللہ کے قانون کے مطابق لوگوں کی راہنمائی کرتے تھے اور اس کے قانون کے مطابق معاملات کا فیصلہ کرتے تھے۔

اولادِ ابراہیمؑ میں سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود مل کر اللہ تعالیٰ کا گھر یعنی مرکز توحید تعمیر فرمایا اور رسوم عبادت اور حج کے طریقے مقرر کیے۔ اسلامی معاشرے کو وجود بخشنے والے تعلیمی تربیتی نصاب کی اللہ تعالیٰ سے منظوری حاصل کی۔ باپ بیٹے کی اس محنت کے نتیجے میں یہ کہنا کہ ان کی اولاد نے مکہ مکرمہ اور اس کے اطراف واکناف پر توحید کے عملی تقاضوں کو نافذ کیا' بالکل صحیح ہوگا۔ کئی صدیاں گزرنے کے بعد یہ مرکزِ توحید مرکز کفر وشرک میں تبدیل ہو گیا۔ دوسری طرف یہود ونصاریٰ نے تورات اور انجیل میں من مانی تبدیلیاں کر کے حقیقت کو ضائع کر دیا۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے مکہ مکرمہ میں نبی آخر الزماں حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عام الفیل / ۵۷۱ء میں پیدا فرمایا اور یوں آپؐ حضرت مسیح علیہ السلام کے رفع سماوی کے پونے چھ سو سال بعد اس دنیا میں تشریف لائے۔ چالیس سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے نبوت ورسالت کی ذمہ داری آپؐ پر ڈالی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا حق ادا کرتے ہوئے اپنی زندگی کے تیئیس سالوں میں جزیرہ نمائے عرب سے کفر وشرک کو مٹا کر دین اسلام کا مکمل نفاذ کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلفائے راشدین نے مزید تیس بتیس سال میں اُس وقت کی معلوم پوری

دنیا سے کفر وشرک ختم کر کے اسے اسلام کے تابع کر دیا۔

ہر اصلاح کے بعد لوگ فتنہ وفساد کے شکار ہوتے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر فتنہ وفساد کے بعد اصلاح کا عمل کیا ہے کہ لوگوں کو اپنے دین کے مطابق زندگی گزارنے کی ہمت اور توفیق بخشی ہے۔ یہ اصلاح کا دور کتنے عرصہ پر محیط تھا اور اس کے بعد فتنہ وفساد کا دور کتنا لمبا تھا' انبیاء سابقہ کی تاریخ سے کچھ زیادہ بہتر اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے دین اسلام کے غلبہ کی تاریخ اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ بہترین طریقے سے محفوظ ہے۔ اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بناؤ اور بگاڑ کا دورانیہ کتنا ہو سکتا ہے اور بگاڑ کن مراحل سے گزر کر اپنی انتہا کو پہنچتا ہے۔ بگاڑ کی انتہا کے بعد دوبارہ اصلاح کا عمل کس طرح شروع ہوتا ہے۔ خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے فرمانِ عالی شان میں یہ ادوار گن کر بتا دیے۔

اس ضمن میں مرکز تنظیم اسلامی کے شعبۂ تحقیقِ علمی کی تحقیق کا نچوڑ ذیل میں پیشِ خدمت ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے زمانے سے لے کر قیامت تک پانچ ادوار کا ذکر فرمایا ہے۔ یہ مسند احمد بن حنبلؒ کی روایت ہے' جسے سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے:

((تَكُوْنُ النُّبُوَّةُ فِيْكُمْ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اَنْ يَّرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةً عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ، فَتَكُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَّرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا عَاضًّا' فَيَكُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اَنْ يَرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا جَبْرِيَّةً ' فَتَكُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اَنْ يَّرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةً عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ)) ثُمَّ سَكَتَ [رواه احمد]

''تمہارے اندر نبوت کا دور رہے گا جب تک اللہ چاہے گا کہ رہے۔ پھر اللہ اسے اٹھا لے گا جب اٹھانا چاہے گا۔ پھر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہوگی۔ پس یہ (دوسرا دور بھی) جاری رہے گا جب تک اللہ چاہے گا کہ جاری رہے۔ پھر جب اللہ چاہے گا تو اس کو اٹھا لے گا۔ اس کے بعد کاٹ کھانے والی حکومت کا دور آئے گا۔ یہ دور بھی رہے گا جب تک اللہ چاہے گا۔ پھر اللہ جب چاہے گا اسے بھی ختم فرما دے گا۔ پھر جابرانہ بادشاہت کا ایک دور آئے گا۔ پھر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ (دوبارہ) قائم ہوگی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموش ہو گئے۔''

پہلا دور: دورِ نبوت سیدنا محمد ﷺ

ولادت باسعادت ۵۷۱ء تا وفات ۶۳۳ء (۱۱ھ)

سیدنا آدم علیہ السلام پہلے انسان اور پہلے نبی تھے' لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ انسانیت اور نبوت کے قافلے ایک ہی وقت میں آغازِ سفر کر کے منزل کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ انسان ایک طرف اپنے تجربے اور علم الاسماء کے بل بوتے پر آگے بڑھتا چلا گیا' جبکہ دوسری طرف خالقِ ارض وسماء انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعے خصوصی ہدایات دے کر اس سفرِ حیات کو گمراہیوں کی دلدل سے نکال کر آسودۂ منزل فرماتا رہا ہے۔ علم کے دور کو عروج اس وقت نصیب ہوا جب انسان اپنے تجرباتی علوم کے سہارے دورِ جدید (modern age) کی دہلیز پر پہنچا ہے۔ انسانیت کی معراج اجتماعی سطح پر آزادی' اخوت اور مساوات کا حصول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رحمۃ للعالمین ﷺ کو مبعوث فرما کر انسانی فطرت کی امنگوں کو عین منشائے الٰہی قرار دیا۔ سیدنا محمد ﷺ کی مجاہدانہ سرگرمیوں سے عالمِ واقعہ میں ان اعلیٰ اقدار پر مبنی ایک انسانی معاشرہ بھی تشکیل دے دیا گیا جس کی نظیر انسانی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ اس اُمّت کا پہلا بے مثال دور آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے ساتھ ہی ختمِ نبوت کی شان لیے ختم ہو گیا۔

دوسرا دور: دورِ خلافتِ راشدہ (خلافت علیٰ منہاج النبوۃ)

(۶۳۳ء تا ۶۶۱ء/۱۱ھ تا ۴۰ھ)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت سیدنا محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی تربیت یافتہ تھی اور انہی کے ایثار و قربانی سے نبی اکرم ﷺ کے دستِ مبارک سے ایسا انقلاب آیا کہ جس میں آزادی' اخوت اور مساوات کی اعلیٰ اقدار رچی بسی تھیں۔ صحابہؓ کی جماعت بھی عملاً انہی اقدار کا نمونہ تھی جس میں تقویٰ اور اہلیت اصل معیارِ شرافت ونجابت تھے۔

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا دور تو انقلاب دشمن قوتوں اور جھوٹی نبوت کے دعوے داروں اور منکرینِ زکوٰۃ کی سرکوبی میں گزرا۔ یوں وہ اسلام کی بنیادیں مضبوط کر کے صاف میدان سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حوالے کر گئے۔ عدل و انصاف' امن وسکون اور اعلیٰ اقدار پر مبنی اسلامی تعلیمات کا ظہور دورِ فاروقیؓ میں ہوا۔ دورِ عثمانیؓ میں یہ سیلِ رواں آگے بڑھا اور تین براعظموں پر اسلامی حکومت قائم ہوئی۔ لیکن یہود نے عہدِ صدیقی میں جس سازش کا بیج بویا تھا' آتش

پرستانِ فارس کے جوشِ انتقام نے اسے تناور درخت بنا دیا تھا۔ جس کا نتیجہ خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت کی صورت میں سامنے آیا تھا۔ دورِ عثمانیؓ میں یہودیوں اور عجمیوں کی سازشیں اپنی انتہا کو پہنچ کر ''الفتنۃ الکبریٰ'' کی صورت اختیار کر گئیں اور باغیوں نے خلیفۂ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔ یہ فتنہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اپنے عروج پر پہنچا تو فتنہ وفساد اور باہمی خانہ جنگی نے اُمّتِ مُسلمہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا دور ایسے داخلی فتنوں کی سرکوبی میں صرف ہو گیا جو اعلیٰ اسلامی اقدار کے مخالف تھے اور اخوت و مساوات سے گریزاں تھے۔ انسانی معاشرہ ابھی ان اعلیٰ اقدار کو ہضم نہیں کر سکا تھا اور اس عظمت والے دور سے دوبارہ (عام معروضی حالات کے جبر کے تحت) واپس آنا شروع ہو گیا تھا۔

تیسرا دور: دورِ ملوکیت (کاٹ کھانے والی بادشاہتیں)

۶۶۲ء تا اَواخر اٹھارہویں صدی یعنی ۴۰ھ تا ۱۲۰۰ھ

(دورِ بنواُمیہ' دورِ بنوعباس' دورِ عثمانیہ اور دورِ مغلیہ)

دورِ خلافتِ راشدہ کی برکات یک لخت ختم نہیں ہو گئیں بلکہ آہستہ آہستہ تبدیلی آتی گئی' حتیٰ کہ دورِ بنوامیہ کے آخر میں اگرچہ نام کی خلافت باقی رہی مگر عملاً کاٹ کھانے والی (مخالف کو برداشت نہ کرنے والی) بادشاہت کا دور آ گیا۔

عوام کے لیے اسلامی قانون اور شریعت کا دور دورہ رہا' مگر حکمران طبقات نے اپنے آپ کو اسلامی تعلیمات سے مستثنیٰ قرار دے لیا۔ نتیجتاً خلفاء کی زندگیاں پرتعیش ہو گئیں اور سرکاری محصولات اب چہیتوں اور وفاداروں میں تقسیم ہونے لگے۔ امراء کے زیر اثر ایک جاگیردار طبقہ پیدا ہوا اور یوں غیر حاضر زمینداری' بیگار اور استحصالی زراعت جیسے معاملات کے جواز زیر بحث آئے' جن پر عمل درآمد ہوتا گیا۔ عوام تک عدل و انصاف اور اخوت و مساوات کی برکتیں پہنچنا ختم ہو گئیں۔ دعوت وتبلیغ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر جو خلافتِ راشدہ کی بنیادیں تھیں' اب نسیاً منسیا ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ مسلمان تاجدارانِ ہند نے عوام کا پیسہ عیاشی پر صرف کیا' جبکہ تاج محل اور شالامار باغ تو تعمیر کرائے مگر مقامی زبانوں میں قرآن مجید کا ترجمہ نہ کرایا جا سکا۔ (تاہم اس دور میں کچھ علم دوست حکمرانوں کے تعاون اور حوصلہ افزائی سے مسلمان مفکّرین اور علمائے علوم الاسماء کی محنت نے آنے والے دور میں تحقیق و ایجاد کے بل پر

چھانے والی قوتوں کو ایک بنیاد ضرور فراہم کر دی۔)

چوتھا دور: دورِ غلامی (جبر والی ملوکیت)

انیسویں صدی تا ایں دم' یا تیرہویں صدی ہجری سے اب تک

مسلمان بادشاہوں کی عیاشیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی مشیت نے مسلمانوں سے حکومتیں چھین کر مغرب سے اٹھنے والی استعماری طاقتوں کے حوالے کر دیں۔ مشرق و مغرب میں مسلمانوں کی حکومتیں کچی دیواروں کی طرح زمین بوس ہوتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد دنیا کے نقشہ پر کوئی خطہ ایسا نہ تھا جہاں مسلمانوں کی کوئی مملکت ہو' سوائے ترکی کے۔ سب یورپی طاقتوں کے غلام بن گئے تھے۔ یورپی طاقتوں نے اپنا اجتماعی ظالمانہ قانون بنایا تاکہ محکوم مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ عرصہ غلام رکھا جا سکے۔ اس دور میں اسلام نکاح' طلاق' طہارت' وضو اور نماز کے مسائل تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ تاہم پھر اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے جِدّوجُہد بھی شروع ہو گئی۔ چنانچہ بیسویں صدی عیسوی میں زوال کے ساتھ عروج کی طرف سفر کا آغاز بھی ہو گیا اور شیخ الہند' علامہ اقبال' ابوالکلام آزاد اور دیگر انقلابی شخصیات نے عوام پر بے پناہ اثر ڈالا۔ پاکستان کا قیام بھی اسی عمل کا حصّہ تھا۔

پانچواں دور: خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دورِ ثانی یعنی مثالی اسلامی فلاحی مملکت کا قیام اور عالمی غلبہ

اکیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک مسلم اکثریت کے تقریباً تمام علاقے سیاسی آزادی حاصل کر چکے تھے۔ اب دنیا کو مغرب نے مالی طور پر غلام بنا کر اور تہذیب اور ترقی کے نام پر ماتحت بنا رکھا ہے۔ تاہم عالمی طور پر غلبۂ اسلام' خلافت اور اسلام کے نظامِ عدل وقسط کے قیام کے عنوانات سے خوب زور وشور سے محنت ہو رہی ہے۔ نبی کریم ﷺ کے ہاتھوں جس انقلاب کی بنیاد پڑی تھی اس کے پیچھے رسالت مآب ﷺ کا وجودِ اَقدس اور وہ جماعتِ صحابہ تھی جس نے آپؐ سے براہِ راست فیض پایا تھا۔ آج ہمارے پاس ایسے نفوسِ قدسیہ نہیں ہیں' لیکن قرآن باقی ہے' نبی پاک ﷺ کی احادیث ہیں' خلافت راشدہ کے قرائن ہیں' اَسلاف کا علمی سرمایہ ہے۔ اور ساتھ ہی انسان نے تجرباتی علوم اور سوشل سائنسز میں جو ترقی کی ہے اس کا

ایک بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔ لہٰذا ہم اس دہلیز پر کھڑے ہیں کہ کوئی بندۂ حق آگے بڑھ کر قرآن وسنّت سے تمسک کر کے خلافتِ راشدہ کے اجماع کے اندر رہتے ہوئے' اَسلاف کی علمی میراث سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک مثالی اسلامی جمہوری فلاحی ریاست قائم کر دے تو دنیا اس کا نقشہ قبول کرنے کے لیے بے تاب ہے اور اسلام کا غلبہ یقینی ہے۔

تاریخ انسانی میں اقامتِ دین کے تسلسل کے جائزے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مطلوب ہے کہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے قیام میں کتنا عرصہ چاہیے اور یہ کام جن شخصیات کے ہاتھوں سے پایۂ تکمیل کو پہنچے گا وہ کس کردار کی حامل ہوں گی۔

پہلی بات کے لیے اگر ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے درمیانی عرصہ کو اس بات کی بنیاد مان لیں کہ ایک اصلاح کے بعد فتنہ وفساد کے تقریباً چھ سو سال بعد دوسرا اصلاح کا کام شروع ہو سکتا ہے تو ہمیں اس بات کا تعیّن کرنا ہوگا کہ دینِ اسلام کا دُرِّ شہوار انسانیت کے ہاتھوں سے کب گم ہوا۔ اس کے بعد سے چھ سو سال کے عرصے کے بعد دوبارہ دنیا اصلاح قبول کرنے کے قابل ہو گی یا فتنہ وفساد اس درجہ کو پہنچ جائے گا کہ خالق کائنات کی طرف سے اصلاح کا بندوبست ضروری ہو جائے؟ بہرحال زمانہ حاضر میں حالات کس قدر گھمبیر ہیں' یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ ایک دوسری حدیث ملاحظہ ہو جس میں صرف چار ادوار تک کی پیشین گوئی ہے اور چوتھے دور کی گھمبیرتا کو زیادہ واضح کر کے بیان کیا گیا ہے۔ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ هٰذَا الْاَمْرَ بَدَاَ نُبُوَّةً وَرَحْمَةً، ثُمَّ يَكُوْنُ خِلَافَةً وَرَحْمَةً، ثُمَّ مُلْكًا عَضُوْضًا، ثُمَّ كَائِنٌ جَبْرِيَّةً وَعُتُوًّا وَفَسَادًا فِي الْاَرْضِ، يَسْتَحِلُّوْنَ الْحَرِيْرَ وَالْفُرُوْجَ وَالْخُمُوْرَ، يُرْزَقُوْنَ عَلٰى ذٰلِكَ وَيُنْصَرُوْنَ، حَتّٰى يَلْقَوُا اللّٰهَ)) (رواه البيهقي في شعب الايمان' بحواله مشكاة المصابيح' كتاب الرقاق)

''یہ امر (یعنی دین اسلام) نبوت ورحمت کے ساتھ ظاہر ہوا۔ پھر (اس دین اسلام کا جو زمانہ آئے گا وہ) خلافت ورحمت کا زمانہ ہوگا۔ پھر کاٹ کھانے والی بادشاہت کا زمانہ ہوگا۔ اور پھر ظلم وجور' قہر وتکبّر اور زمین پر فتنہ وفساد کا زمانہ ہوگا۔ اُس وقت لوگ ریشمی

کپڑوں کو جائز کر لیں گے‘ عورتوں کی شرمگاہوں اور شراب کو حلال قرار دیں گے‘ لیکن اس کے باوجود ان کو رزق دیا جائے گا اور ان کی مدد کی جائے گی‘ یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ سے جا ملیں۔‘‘

’’مظاہرِ حق‘‘ میں اس کی تشریح یوں کی گئی ہے:

’’ظلم و جور‘ قہر و تکبّر اور زمین پر فتنہ و فساد کا زمانہ ہوگا‘‘ مطلب یہ ہے کہ آخر میں جو زمانہ آئے گا وہ اسلام اور مسلمانوں کے حق میں اور زیادہ سخت ہوگا۔ نااہل لوگ تختِ حکومت پر بیٹھیں گے‘ ظلم و زیادتی‘ انتشار اور بدامنی کا دور دورہ ہوگا‘ عام لوگوں کی جان و مال‘ عزّت و آبرو غیر محفوظ ہوگی۔ ہر طرف لوٹ مار اور غارت گری روئے زمین پر پھیل جائے گی اور انسانیت کو تباہ کرنے والی ہر طرح کی برائیاں روئے زمین پر پھیل جائیں گی۔‘‘

(تشریح از مظاہرِ حق‘ ج ۶‘ ص ۷۱۰)

چوتھے دور کی یہ تصویر نہ صرف ممالک اسلامیہ کی ہے‘ بلکہ ان وجوہات کی بنا پر دنیا میں کوئی مسلم مملکت ایسی نہیں جو غیروں کی طرف سے مسلمانوں پر ہونے والے ظلم کے خلاف کھڑا ہونا تو دور کی بات ہے‘ آواز بھی اٹھا سکے۔ غیروں کے مقابلے میں مسلمانوں کی اس کمزوری کا سبب بھی نبی کریم ﷺ نے بیان فرما دیا:

عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: ((یُوْشِکُ الْاُمَمُ اَنْ تَدَاعٰی عَلَیْکُمْ کَمَا تَدَاعَی الْاَکَلَۃُ اِلٰی قَصْعَتِھَا)) فَقَالَ قَائِلٌ: وَمِنْ قِلَّۃٍ نَحْنُ یَوْمَئِذٍ؟ قَالَ: ((بَلْ اَنْتُمْ یَوْمَئِذٍ کَثِیْرٌ وَلٰکِنَّکُمْ غُثَاءٌ کَغُثَاءِ السَّیْلِ‘ وَلَیَنْزِعَنَّ اللّٰہُ مِنْ صُدُوْرِ عَدُوِّکُمُ الْمَھَابَۃَ مِنْکُمْ ‘ وَلَیَقْذِفَنَّ فِیْ قُلُوْبِکُمُ الْوَھْنَ)) قَالَ قَائِلٌ: وَمَا الْوَھْنُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟ قَالَ: ((حُبُّ الدُّنْیَا وَکَرَاھِیَۃُ الْمَوْتِ))[رواہ ابوداؤد‘ والبیھقی ۔ مشکاۃ المصابیح‘ کتاب الرقاق]

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ’’عنقریب ایسا وقت آنے والا ہے جب اقوامِ عالم ایک دوسرے کو تم پر ٹوٹ پڑنے کی دعوت دیں گی جیسا کہ دسترخوان پر جمع ہونے والے لوگ آپس میں ایک دوسرے کو کھانے پر بلاتے ہیں‘‘۔ کسی صحابیؓ نے (یہ سن کر) عرض کیا: کیا یہ اس سبب سے ہوگا کہ اُس وقت ہم تعداد میں

کم ہوں گے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: (ایسا اس وجہ سے نہیں ہوگا کہ تم تعداد میں کم ہو گے) بلکہ اُس وقت تمہاری تعداد تو بہت زیادہ ہوگی‘ لیکن تمہاری حیثیت جھاگ (اور جھاڑ جھنکاڑ) سے زیادہ نہ ہوگی‘ جیسا کہ سیلاب کا جھاگ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ یقیناً تمہارے دشمنوں کے دل سے تمہاری ہیبت اور رعب نکال دے گا اور خود تمہارے دلوں میں وہن (کی بیماری) پیدا کر دے گا‘‘۔ کسی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول (ﷺ)! وہن کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: دنیا کی محبّت اور موت سے بیزاری۔‘‘

یہ حالات اتنے جبر کے ساتھ اُمّت پر مسلّط ہیں کہ جزر کے بعد مدّ کی کوئی امید نظر نہیں آ رہی۔ لیکن نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ان حالات کے بعد خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے دور کی جو بشارت دی ہے یقیناً وہ پوری ہو کر رہے گی۔ وہ ہستی جس نے اس وقت پوری دنیا کو ایک جرثومہ (کورونا) کے ذریعے بے بس کر دیا ہے‘ وہ اس پر قدرت رکھتا ہے کہ وہ افرادِ اُمت میں جذبہ صدیقیؓ اور غیرتِ فاروقیؓ پیدا کر دے۔ اُمت مرحومہ کس طرح اپنی عظمتِ رفتہ کو آواز دینے کے لیے بے چین ہے‘ اس کا اشارہ بھی ایک باطل ذریعہ ابلاغ (مراد ترکی ڈرامہ سیریز ’’ارطغرل‘‘ ہے) کے ذریعے سامنے آ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ﴿مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ﴾ کے مصداق وہ سب جس کا اس نے اپنے رسولوں کے ذریعے وعدہ کیا ہے‘ عطا کر کے اپنے دین کو دنیا میں سربلند فرما دے۔

ایک دوسرے رخ سے بھی اس معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ کیا اس طرح کے حالات انبیاء و رسل علیہم السلام کو پہلے پیش نہیں آتے تھے؟ اس ضمن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا یَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰی نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ ﴿۲۱۴﴾﴾ (البقرۃ)

’’کیا تم سمجھتے ہو کہ جنّت میں چلے جاؤ گے حالانکہ تم پر ان لوگوں جیسے حالات نہیں گزرے جو تم سے پہلے ہو چکے ہیں‘ کہ پہنچی ان کو سختی اور تکلیف اور ہلا مارے گئے یہاں تک کہ (وقت کا) رسول اور اس کے ساتھ ایمان والے کہہ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ آگاہ رہو اللہ کی مدد قریب ہے!‘‘

حالات کی شدّت کس قدر ہوسکتی ہے قرآن مجید اس پر گواہ ہے۔ رسول اور اہلِ ایمان پکار اٹھتے ہیں کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ لیکن اللہ تعالیٰ امید کی ڈور ٹوٹنے نہیں دیتے۔ یہاں تک کہ اللہ کی مدد سے حالات بدل جاتے ہیں۔ بایں ہمہ وجوہ گہری نظر سے دیکھنے والوں کو یہ سمجھنا ذرا بھی مشکل نہیں ہے کہ جس طرح پہلی اقوام کو اللہ تعالیٰ نے تباہ و برباد کر دیا اسی طرح آج اہل اسلام کو تختۂ مشق بنانے والی کافر و مشرک اقوام کو بھی تباہ و برباد کر سکتا ہے۔ یہ اقوام وہ تھیں جن میں سے کسی نے نظریاتی حدوں کو پامال کیا' کسی نے معاشرت تو کسی نے معیشت میں اودھم مچایا' کسی نے سیاست اور حکمرانی میں اللہ تعالیٰ کی اعلیٰ حیثیت کو چیلنج کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب کو نیست و نابود کر دیا۔ اِس وقت بغاوت اور سرکشی کی قیادت کرنے والوں نے زندگی کے تمام گوشوں میں انسانوں کو جہنم کا ایندھن بنانے کے لیے شیطانِ لعین کی پیروی پر مجبور کیا ہوا ہے' تو کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو تباہ و برباد کر کے اپنے صالح بندوں کو موقع نہیں دے گا۔ لیکن اس بگاڑ کی اصلاح بھی اسی طرح ہو گی جس طرح پہلے بگاڑ کی ہوئی تھی۔ اس فرق کے ساتھ کہ دورِ اوّل کی اصلاح نبی کریم ﷺ کی قیادت میں بہت سارے السابقون الاوّلون اور بہت سارے اصحابُ الیمین کے ذریعے کی گئی تھی' جبکہ دورِ آخر کی اصلاح السابقون المقرّبون کی قلیل تعداد اور اصحابُ الیمین کی بڑی تعداد کے ذریعے ہو گی۔ یہ وہ گروہ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ الجمعہ میں فرمایا:

﴿وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝۳ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ۝۴﴾

''اور ان ہی میں سے ان دوسرے لوگوں میں بھی جو ابھی ان میں شامل نہیں ہوئے۔ اور وہ بہت زبردست ہے' کمال حکمت والا ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے وہ دیتا ہے جسے چاہتا ہے' اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔''

یہ وہ لوگ ہیں جو ان لوگوں کا مقابلہ کریں گے جن کو تورات دی گئی تھی۔ انہوں نے اس کا حق ادا نہیں کیا اور اپنے معاشرے کو گدھوں کے معاشرہ میں بدل دیا۔ تو یہ نفوسِ قدسیہ جو اس معاشرے کو عباد الرحمٰن کے معاشرے میں بدل دیں گے' ان کا تربیتی نصاب یقیناً چار نکاتی محمدی تعلیمی تربیتی نصاب ہو گا۔ یہ لوگ نبی اور رسول نہیں ہوں گے بلکہ یہ لوگ انبیاء اور رسولوں جیسے یقین اور عزم و ارادے والے السابقون الاوّلون اور اصحاب الیمین کی طرح کے لوگ ہوں گے۔ اللہ

تعالیٰ نے اصلاح کا کام جن نفوسِ قدسیہ سے لیا ہے' انہوں نے وقت کے بڑے طلسم کا پردہ چاک کر کے انسانیت کے سامنے حقیقت کو پیش کیا ہے۔ اس دور کا طلسم کیا ہے؟ جس کی دنیا دیوانی ہے اور اس کے رعب سے مرعوب ہے؟ آج کے دور کا طلسم وہ ہے جس کی نظریاتی دھجیاں بکھیرنے والوں کے سرخیل علامہ اقبال ہیں۔ اب ع ''دگر دانائے راز آید کہ ناید'' کے مصداق ایسی شخصیت یا اشخاص کی ضرورت ہے جو ایمان کے ساتھ عمل صالح کی قوت کو استعمال کر کے کفریہ طاقتوں کے جھوٹے نگوں کو ریزہ ریزہ کر دیں۔ یہ کون لوگ ہیں' ان کی شخصیت کے خدوخال بھی ہمیں بتا دیے گئے ہیں۔ یہ مومنین مفلحین کی صفات کے حامل عباد الرحمٰن ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ﴾ کے نقش قدم پر چلنے والے لوگ ہیں۔ ان لوگوں سے اللہ کا وعدہ ہے:

﴿وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝۴۰﴾ (الحج)

''اللہ ضرور بالضرور مدد کرے گا اُس کی جو مدد کرے گا اُس کی۔ بے شک اللہ قدرت والا' زور والا ہے۔''

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝۷﴾ (محمد)

''اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو جما دے گا۔''

﴿وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ ؕ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ۝۱۲﴾

(المائدۃ)

''اور اللہ نے کہا: بے شک میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اگر تم نماز قائم رکھو گے' زکوٰۃ دیتے رہو گے اور یقین کرو گے میرے رسولوں پر اور ان کی مدد کرو گے اور اللہ کو قرض دو گے اچھی طرح کا قرض تو ضرور بالضرور میں دور کر دوں گا تم سے تمہاری برائیاں (کمیوں اور کوتاہیوں کا ازالہ کروں گا) اور ضرور بالضرور داخل کروں تمہیں ان باغات میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ پھر جس نے اس کے بعد تم میں سے کفر کیا تو بے شک وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔''

حضرت ہود علیہ السلام کی زبان سے اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا:

﴿وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۵۲﴾﴾ (ھود)

''اور اے میری قوم! گناہ بخشواؤ اپنے رب سے' پھر رجوع کرو اُس کی طرف' وہ تم پر آسمان سے بارشیں برسائے گا دھواں دار اور تمہاری قوت پر مزید قوت کا اضافہ کر دے گا اور مجرمانہ روگردانی نہ کرو۔''

اسی طرح کا وعدہ حضرت نوح علیہ السلام کی زبان سے کروایا گیا تھا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ مبارک پر یہ کلام جاری فرمایا:

﴿اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ۝۲ وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ۝۳﴾ (ھود)

''عبادت نہ کرو مگر اللہ کی' میں اُس کی طرف سے تمہارے لیے نذیر اور بشیر ہوں۔ اور یہ کہ گناہ بخشواؤ اپنے رب سے پھر رجوع کرو اُس کی طرف' وہ تمہیں وقت معیّن تک اچھا فائدہ دے گا اور ہر صاحبِ فضل کو اپنے فضل سے نوازے گا۔ اور اگر تم نے روگردانی کی تو میں تمہارے بارے میں ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔''

﴿وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا﴾ (الفتح:۲۰)

''اللہ نے تم سے وعدہ کیا بڑی بڑی غنیمتوں کا جو تم حاصل کرو گے۔''

ذاتِ باری تعالیٰ نے کتنی ہی بشارتیں اور وعدے اہلِ ایمان سے کیے ہیں۔ سورۃ النور میں فرمایا:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۵۵ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝۵۶﴾ (النور)

''اللہ تعالیٰ نے وعدہ کر لیا ہے تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں کہ وہ ضرور بالضرور انہیں زمین میں خلافت عطا کرے گا' جیسے اس نے ان کے پہلوں کو خلافت عطا کی تھی۔ اور اس دین کو جس کو اس نے ان کے لیے پسند کر لیا ہے جما دے گا اور خوف کے بدلے میں ان کو امن عطا کرے گا۔ وہ میری بندگی کریں گے اور کسی کو میرا شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ اور جو کوئی ناشکری کرے گا اس کے بعد تو وہی لوگ نافرمان ہیں۔ اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اطاعت کرو رسول کی تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔''

یہاں مجرد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کا حکم دینے سے یہ واضح ہو گیا کہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے احیاء کا کام اطاعتِ رسولؐ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۵﴾﴾ (الانبیاء)

''اور یقیناً ہم نے ذکر کے بعد زبور میں لکھ دیا کہ بے شک زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے۔''

اتنے پختہ وعدوں کے بعد بھی اگر اہلِ ایمان اللہ کے دین کی نصرت اور غلبہ کے لیے کمر نہیں کستے تو پھر سورۃ المائدۃ کی آیت ۱۲ کے آخری الفاظ ﴿فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۲﴾﴾' سورۂ ہود' آیت ۳ کے آخری الفاظ ﴿وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ۝۳﴾' سورۂ ھود' آیت ۵۲ کے آخری الفاظ ﴿وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۵۲﴾﴾ اور سورۃ النور' آیت ۵۵ کے آخری الفاظ ﴿وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۵۵﴾ کی تصویر کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ یہی حالات کی وہ تصویر ہے جو حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ اور معاذ بن جبلؓ کی بیان کردہ حدیث میں الصادق المصدوق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے ہمیں بتا دی گئی ہے:

((ثُمَّ كَانَ جَبْرِيَّةً وَعُتُوًّا وَفَسَادًا فِي الْاَرْضِ يَسْتَحِلُّوْنَ الْحَرِيْرَ وَالْفُرُوْجَ وَالْخُمُوْرَ))

''پھر اس دین کا وہ زمانہ آئے گا جو ظلم و جور' قہر و تکبر اور زمین پر فتنہ و فساد کا زمانہ ہو گا۔ اس وقت لوگ ریشمی کپڑوں کو جائز کر لیں گے' عورتوں کی شرمگاہوں اور شراب کو حلال

قرار دیں گے۔‘‘

لیکن آپ ﷺ نے فرمایا: ((یُرْزَقُوْنَ عَلٰی ذٰلِکَ وَیُنْصَرُوْنَ)) ’’اس کے باوجود انہیں رزق دیا جائے گا اور ان کی مدد کی جائے گی‘‘۔ شرح مشکوٰۃ ’’مظاہرِ حق‘‘ میں حدیث مبارکہ کے ان الفاظ کی وضاحت انتہائی امید افزا الفاظ سے کی گئی ہے۔ لکھتے ہیں:

’’لوگ اگرچہ اتنی سخت بدعملیوں اور خدا کی نافرمانی میں مبتلا ہوں گے اور اس اعتبار سے وہ عذابِ خداوندی کے مستوجب اور ہلاکت وتباہی کے مستحق ہوں گے‘ مگر حق تعالیٰ کی اس رحمت کے سبب جو کہ اُمّتِ مرحومہ کے لیے مخصوص ہے ان کو یہاں عذاب میں مبتلا نہیں کیا جائے گا اور اس میں شاید حق تعالیٰ کی کوئی حکمت پوشیدہ ہو۔ مثلاً یہ کہ ان سے مخلوقِ خداوندی کے نظم ونسق اور انتظامِ مملکت کا وہ کام لیا جانا مقصود ہوگا جس کی اہلیت و صلاحیت وہی رکھیں گے یا یہ کہ اگرچہ وہ لوگ خود فاسق و بدکار ہوں گے لیکن ان کے ہاتھوں دین کی اصلاح اور درستی کا کوئی کام انجام پانا مقدر ہوگا۔‘‘

وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ یہ منزل ظہورِ مہدی کے بعد ہی سر ہوگی ان کی بات کچھ انہی اصحابِ موسیٰؑ کی طرح ہے جنہیں جہاد کے ذریعے شہر فتح کر کے شریعت کے نفاذ کا حکم دیا گیا تھا‘ اس کے باوجود کہ انہیں اللہ کے رسول علیہ السلام نے یقین دلایا تھا کہ بس دروازے تک پہنچ جاؤ تو دشمن ہتھیار پھینک دے گا‘ لیکن انہوں نے بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تھا:

﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝۲۴﴾ (المائدۃ)

’’(موسیٰ) بس آپ جائیں اور آپ کا رب جائے اور دونوں جنگ کریں‘ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔‘‘

اس جواب پر اللہ تعالیٰ اتنے ناراض ہوئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی موجودگی میں انہیں چالیس سال تک صحرائے سینا میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا گیا‘ جبکہ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہنے پر اصحابِ محمد ﷺ نے اتنے عرصہ میں پوری دنیا پر اسلام غالب فرما دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے اتنے پختہ وعدوں کے باوجود ہم تحفظات کا شکار ہیں۔ تحفظات کا شکار ہو کر ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا ہے؟ سوائے ریشم کے کیڑوں جیسے گھر بنانے کے ہماری پیش رفت کیا ہے؟ بجائے پیش رفت کے مسلسل پسپائی کا معاملہ ہے۔ ہمیں اپنے آگے‘ اپنے پیچھے‘ اور دائیں بائیں چلنے والوں اور خود اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھنا ہوگا۔ کیا ہم ان مراحل سے گزرنے کے لیے تیار ہیں جن سے السابقون الاوّلون اور اصحاب الیمین گزرے تھے۔ سورۂ آل عمران میں ان نفوسِ قدسیہ کی

دعا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبولیت کا جواب اور قبولیت حاصل کرنے والوں کے اوصاف کا ذکر کر دیا گیا ہے:

﴿رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۣ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۝۱۹۳ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰي رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝۱۹۴ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّىْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝۱۹۵ لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ۝۱۹۶ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۣ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝۱۹۷﴾

’’اے ہمارے رب! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی ندا دے رہا تھا کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر‘ سو ہم ایمان لے آئے۔ اے ہمارے رب! ہمارے گناہ بخش دے اور ہم سے ہماری برائیاں دور کر دے اور نیک لوگوں کے ساتھ ہمیں موت دے۔ اے ہمارے رب! ہمیں عطا کر وہ سب کچھ جس کا تُو نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے ہم سے وعدہ کیا ہے اور ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کرنا‘ بے شک تُو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔ پس ان کے رب نے ان کی دعا قبول کی (اور فرمایا) کہ مَیں ضائع نہیں کرتا تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو‘ چاہے مرد ہو یا عورت۔ تم آپس میں ایک دوسرے سے ہو۔ پس جن لوگوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور قتال کیا اور قتل بھی ہوئے‘ میں ضرور ان کی برائیاں ان سے دور کر دوں گا اور ضرور داخل کروں گا انہیں ان باغات میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ یہ بدلہ ہوگا اللہ کے پاس سے‘ اور بہترین بدلہ تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ (اے نبی ﷺ!) آپ کو دھوکے میں نہ ڈالے ان کافروں کی چلت پھرت شہروں کے اندر۔ یہ تو بس تھوڑا سا فائدہ اٹھانا ہے‘ پھر ان کا ٹھکانہ جہنّم ہی ہے۔ اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔‘‘

ہجرت و جہاد کی سرزمین افغانستان اور ہمارے درمیان بارڈر کی ایک لکیر ہے۔

افغان طالبان ایک دفعہ وہ اسلامی نظام کا نمونہ پیش کر چکے ہیں اور عالمِ عیسائیت کی بڑی قوتوں کو ناکوں چنے چبوا چکے ہیں۔ درج ذیل حدیث دورِ حاضر میں اوّل درجے پر لوگوں کے احوال کے مطابق ہے:

وَلَنْ تَزَالَ هٰذِهِ الْاُمَّةُ ـــ وفی روایة : لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِیْ وَفِیْ رِوَایَة : لَا تَزَالُ مِنْ اُمَّتِیْ اُمَّةٌ قَائِمَةٌ عَلٰی اَمْرِ اللّٰهِ لَا یَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ ـــ وفی روایة : مَنْ خَذَلَهُمْ ـــ حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ عَلٰی ذٰلِکَ (صحیح البخاری : کتاب العلم والاعتصام والمناقب)

''میری اُمّت میں سے ایک جماعت ضرور اللہ کے حکم پر قائم رہے گی' ان کی مخالفت کرنے والا اور ان کی مدد نہ کرنے والا ان کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکے گا ـــ یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ جائے گا اور وہ اسی حال میں ہوں گے۔''

امام نوویؒ درج بالا حدیث کی وضاحت میں فرماتے ہیں:

''ضروری نہیں اس جماعت کے افراد ایک ہی مقام پر کام کرتے ہوں' بلکہ یہ زمین کے اقطار و اطراف میں پھیلے ہوئے بھی ہو سکتے ہیں۔ کچھ ان میں بہادر اور دلیر مجاہد ہوں گے' کچھ فقہاء اور محدثین ہوں گے' کچھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرتے ہوں گے۔ یہ ایک معجزہ ہے کہ یہ صورت حال دورِ نبویؐ سے لے کر آج تک قائم رہی ہے اور اس وقت تک قائم رہے گی جب تک اللہ کا وہ حکم نہ آ جائے جس کا ذکر حدیث میں آیا ہے۔'' (سلسلہ اشاعت تنظیم اسلامی: التزامِ جماعت' مولانا گوہر رحمٰنؒ)

مجاہدین افغانستان کے ساتھ تعلق استوار کرنا وقت کی ضرورت ہے۔ یہ سرزمین اللہ کے وعدوں کے ظہور کی سرزمین ہے

؎ افغان باقی ' کُہسار باقی
اَلْحُکْمُ لِلّٰہ ' اَلْمُلْکُ لِلّٰہِ!
؎ فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی!

جن لوگوں کی امیدوں کا مرکز ظہورِ مہدی ہے انہیں بھی یہ واضح ہونا چاہیے کہ ''خراسان سے سیاہ جھنڈوں والے لوگ ان کی مدد کو نکلیں گے'' تو کیا موجودہ حالات اس طرح سازگار ہیں

کہ جہادی قوتوں کو آزادانہ آمد و رفت کی سہولت ہو؟ یا جہادی قوتیں اتنی طاقتور ہیں کہ کوئی ان کا راستہ نہ روک سکے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ غلبۂ دین کا کام کرنے والوں کو اس درجہ پر آنے کے لیے وسائل' منصوبہ بندی اور وقت درکار ہے۔ یہ ساری باتیں اس چیز کی متقاضی ہیں کہ ظہورِ مہدی سے پہلے خراسان کے لوگ ایک مضبوط قوت کی شکل اختیار کر چکے ہوں اور غزوۂ ہند کے غنائم سے ان کی کمر مضبوط ہو چکی ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے اللہ تعالیٰ بچے کی پیدائش سے پہلے اس کی زندگی کی ضروریات کا بندوبست کروا دیتے ہیں۔ اس کے لیے کتنا عرصہ درکار ہے' اصحابِ نظر ہی اس کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ دین کی سربلندی کے لیے امام مالکؒ کا قول: لَا یَصْلُحُ آخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُهَا ''جو درحقیقت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اقوال سے ماخوذ ہے' ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ چنانچہ اس زاویے سے بھی ہجرت و جہاد کا جذبہ ہی رہبر اور راہنما ہو سکتا ہے' جس سے راستے کے سارے سنگ ہائے میل واضح ہو جاتے ہیں۔

سوال یہ بھی ہے کہ اس جبر و قہر کے دور میں اُمّتِ مسلمہ مختلف خطوں میں الگ الگ ملکوں کے نام سے بٹی ہوئی ہے۔ تو کیا غلبۂ دین کی تحریک ایک اکائی کی صورت میں ممکن ہے' جبکہ ختمِ نبوت کی بدولت قیادت اب صرف اہلِ ایمان کے پاس ہے اور سُنّت سے بھی یہ راہنمائی ملتی ہے کہ اپنے علاقے اور اپنے ماحول کو اسلام کے تابع کرنا پہلی ذمہ داری ہے۔ پس جان لینا چاہیے کہ ہر خطے اور ملک کے اہل ایمان یہ تحریک اپنی قیادت اور اپنے احوال و ظروف کے مطابق آگے بڑھا سکتے ہیں' لیکن ان کی حیثیت ایسی ہونی چاہیے کہ قالب تو کئی ہوں لیکن روح ایک ہو۔ اللہ تعالیٰ سب کو ایسے جمع فرما دے گا جیسے میدانِ عرفات میں مختلف راستوں سے آنے والوں کو جمع فرما دیتا ہے۔ اس طرح بھی عالمی غلبے کی راہ ہموار کی جا سکتی ہے۔

تنظیم اسلامی پاکستان بھی ایسے قافلوں میں سے ایک قافلہ ہے جس کے التزام جماعت کی بنیاد ہی ''مَا اَنَا عَلَیْهِ وَاَصْحَابِیْ'' پر رکھی گئی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ منزل کی طرف صحیح راہنمائی اور جذبۂ عمل سے نواز دے۔ آمین! ۞۞۞

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

علّامہ اقبال اور عشقِ مصطفیٰ ﷺ

از: ارسلان اللہ خان ☆

ہر کہ عشقِ مصطفیٰ ﷺ سامانِ اوست
بحر و بَر در گوشۂ دامانِ اوست (۱)
(پیامِ مشرق)

کتاب ''اقبالؒ اور قُرآن'' میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب لکھتے ہیں:

''عشقِ رسول ﷺ اور قُرآن مجید ہی سے علّامہ اقبال کے شخصی عناصر کی تعمیر ہوئی ہے۔''

قرآنِ پاک میں ارشاد ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۱﴾ (آلِ عمران)

''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ اگر تُم اللہ سے محبّت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو' اللہ تُم سے محبّت کرے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا' اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

اقبال گویا اسی آیت کی تلمیح فرماتے ہوئے کہتے ہیں:

کی محمد (ﷺ) سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں!
(جوابِ شکوہ' بانگِ درا)

حضرت مجدّد الفِ ثانی قدس سرہ العزیز رحمۃ اللہ علیہ ''مکتوبات'' میں فرماتے ہیں:

''اس آیت شریف کے مضمون میں یہی رمز ہے کہ اتباع کے معنی یہ ہیں کہ ہر چیز جو محبوب کے اخلاق و عادات' اَطوار و گُفتار سے علم میں آئے اُسے تقلید کی دُھن میں محبوب سمجھا جائے۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

☆ ای میل: Khanarsalanullah@gmail.com

((لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ)) (صحیح البُخاری 'کتاب الایمان' باب حُبّ الرّسول ﷺ)

''تُم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ مَیں اُس کے نزدیک اُس کے والد' اُس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔''

جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کیسے تھے؟ تو انہوں نے فرمایا: كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآن ''بس قرآن ہی آپ ﷺ کا اخلاق تھا''۔ (صحیح مُسلم) (۱) یعنی قرآن کریم نے اخلاق کے جو اصول بتائے ہیں' رسول اکرم ﷺ اُن کا عملی نمونہ تھے۔ اس طرح آپ ﷺ گویا مُجسّم قُرآن تھے۔

علّامہ اقبال کے مُطابق اللہ تعالیٰ نے اُمّتِ مُسلمہ کے پیکر کو تخلیق فرمانے کے بعد رسالت سے اس پیکر میں جان ڈالی۔ ملّتِ اسلامیہ کا وجود رسالت ہی کے باعث قائم ہے۔ یہی ہمارے دین اور آئینِ شریعت کی اساس ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ پر شریعت اور ملّتِ اسلامیہ پر ملّت کو ختم کر دیا ہے۔ (۲)

جناب نیاز الدین خان کے نام اپنے ایک خط میں علّامہ اقبال فرماتے ہیں:

''قُرآن مجید کثرت سے پڑھنا چاہیے تا کہ قلب میں محمدی ﷺ نسبت پیدا ہو سکے۔''

معروف مذہبی اسکالر علّامہ شہزاد مجددی فرماتے ہیں کہ اقبالؒ کی فکر کے سوتے آیاتِ قرآنی سے پھوٹتے ہیں' چنانچہ علّامہ اقبال کے عشق کا مفہوم اگر سمجھنا ہو تو قرآن پاک کی اس آیت سے اخذ کیا جا سکتا ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ﴾ (البقرۃ: ۱۶۵)

''اور وہ لوگ جو ایمان والے ہیں' وہ اللہ سے سب سے بڑھ کر محبّت رکھتے ہیں''۔ یعنی محبّت کی شدّت کی آخری حد کا نام ''عشق'' ہے اور اقبال کی فکر کی اساس بھی ''عشق'' ہے۔

پروفیسر نکلسن کو اپنے ایک خط میں علّامہ اقبال لکھتے ہیں کہ:

''عشق کسی شے کو اپنے اندر جذب کرنے کی شدید خواہش کا نام ہے۔''

اقبال کہتے ہیں:

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ!
(گرچہ تو زندانیٔ اسباب ہے' بانگِ درا)

عقل و دل و نگاہ کا مُرشدِ اوّلیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بُت کدۂ تصوّرات
(ذوق وشوق، بالِ جبریل)(ر)

ڈاکٹر اسرار احمدؒ اپنی کتاب ''علّامہ اقبال اور ہم'' میں فرماتے ہیں:

''یہ عرض کرنا تحصیلِ حاصل ہے کہ عشقِ الٰہی کا ایک عکس عشقِ رسول ﷺ بھی ہے۔ اس لیے کہ کون ہے جو نہیں جانتا کہ اطاعت اور محبّت دونوں کے اعتبار سے اللہ اور رسول ﷺ ایک وحدت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علّامہ مرحوم کے کلام میں عشقِ رسول ﷺ کا جذبہ تانے بانے کے مانند پیوست ہے۔''

والدین ماجدین اور اُستاد میر حسنؒ کی تربیت سے علّامہ اقبال کی ذہنی نشوونُما جس نہج پر ہوئی تھی اُس میں تصوّف، روحانیت، خدا ترسی اور سب سے بڑھ کر عشقِ رسول ﷺ کے جذبے کا غلبہ تھا۔ اسی تربیت کے نتیجے میں اقبال کو عشقِ مصطفیٰ ﷺ کی لازوال دولت نصیب ہوئی، جس کا اظہار اُن کی زندگی کے واقعات اور شاعری میں جابجا نظر آتا ہے۔ علّامہ اقبال نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل عشقِ رسول ﷺ کی مہک سے معطّر ایک ایسی رُباعی کہی جو اپنی مثال آپ ہے۔ یہ رُباعی علّامہ اقبالؒ کی کسی کتاب یا کلیات میں موجود نہیں ہے۔ ؎

تُو غنی از ہر دو عالَم مَن فقیر
روزِ محشر عُذر ہائے مَن پذیر
ور حسابم را تُو بینی ناگزیر
از نگاہِ مصطفیٰ ﷺ پنہاں بگیر (۲)

ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی اپنی کتاب ''اقبالؒ اور محبّتِ رسول ﷺ'' میں رقم طراز ہیں کہ:

''رسول اکرم ﷺ کے پیغام کی جانب رجعت، اُسوۂ حسنۂ نبوی ﷺ کا اتباع اور تعلیماتِ نبوی ﷺ پر عمل پیرا ہونے کی تلقین، علّامہ اقبالؒ کی شاعری کے بُنیادی مضامین تھے۔''

علّامہ اقبالؒ نے آج سے کئی سال پہلے مسلمانوں کی جس زبوں حالی کا رونا رویا تھا وہ آج اپنے نقطۂ انتہا کو پہنچ چکی ہے ..... لیکن اقبالؒ کے نزدیک جو کل رفعت وسطوت کا سبب تھا وہی آج کی پستی و مذلّت کا علاج بھی ہے، فرماتے ہیں:

مسلماں آں فقیرے کج کلاہے
رمید از سینۂ اُو سوزِ آہے
دلش نالد چرا نالد نہ داند
نگاہے یا رسول اللہ ﷺ نگاہے! (۳)
(حضورِ رسالت ﷺ، ارمغانِ حجاز)

علّامہ اقبال نے عشقِ رسول ﷺ کے جذبوں کو مہمیز لگانے کے لیے جذبات کو اشعار کے قالب میں ڈھال کر غُلامانِ محمد ﷺ کے قلوب واَذہان میں یوں مرتسم کیا کہ تمام مُعاندانہ مساعی کے باوجود ان جذبوں کو سرد نہیں کیا جا سکتا۔ ''جوابِ شکوہ'' میں علّامہ اقبال کے ان اشعار کے حرف حرف میں موجود حُبِّ رسول ﷺ کی حلاوت سے ایک مسلمان کو بھلا کیسے محروم کیا جا سکتا ہے؟

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنّم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسّم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو، خُم بھی نہ ہو
بزمِ توحید بھی دُنیا میں نہ ہو، تُم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے (ج)

اقبالؒ جانتے تھے کہ لادینی قوتوں کا یہ ایجنڈا ہے کہ کسی طرح ایک مسلمان کے دل سے اُس کے پیارے رسول ﷺ کی محبّت کو ختم کیا جائے، جن کی ناموس پر وہ جان تک دینے کو تیّار رہتا ہے۔ ابلیسی اور طاغوتی طاقتیں جانتی ہیں کہ مسلمان سب کچھ سہہ سکتا ہے لیکن اپنے نبی اکرم ﷺ کی شان میں توہین برداشت نہیں کر سکتا۔ اپنے پیارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا احترام تو جیسے ہر مسلمان کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ چنانچہ وہ مختلف اوچھے ہتھکنڈوں کے ذریعے اس عشقِ رسول ﷺ کو کم کرنے یا اس جذبے کو ٹھنڈا کرنے پر اپنی شیطانی توانائیاں صَرف کرتی ہیں۔ ؎

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمد ﷺ اس کے بدن سے نکال دو!
(ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام، ضربِ کلیم)

اقبالؒ اپنے انگریزی خطبات کے مضامین کے حوالے سے سیّد سلیمان ندویؒ کو (مکتوب نمبر ۱۹ میں) لکھتے ہیں:

''شارعِ اُمّی ﷺ نے وہ اصول بتائے ہیں کہ اُن کی ہمہ گیری کے سامنے حال کے مغربی فقہاء طفلِ مکتب کی حیثیت رکھتے ہیں۔''

فرزندِ اقبال جناب جاوید اقبال صاحب اپنی کتاب ''اپنا گریباں چاک'' میں فرماتے ہیں:

''قرآنِ پاک سنتے وقت یا رسولِ پاک ﷺ کا اسمِ مُبارک زبان پر آتے ہی آپ کی آنکھیں بھر آتی تھیں۔ علّامہ اقبالؒ کو مولانا حالی کی مسدس کا یہ بند ''وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا'' بہت پسند تھا' اس کو سنتے ہی دل بھر آتا اور بے اختیار رونے لگتے۔ آپ کا خیال تھا کہ رسول ﷺ کی سیرت ہی مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کر سکتی ہے۔''

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است
آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰ است (۴)

(اسرارِ خودی)

کتاب ''اقبالؒ کی نعت'' میں جناب صبیح رحمانی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''حضور نبی کریم ﷺ' اقبالؒ کے فکری و تخلیقی تناظر میں مؤمنِ اوّل اور مردِ کامل کے طور پر نُمایاں ہوتے ہیں۔ آپ ﷺ کی زندگی اور اُسوۂ حسنہ ہی اقبالؒ کے قلندر' درویش' مردِ خود آگاہ و خُدا مست کے لیے مشعلِ راہ کا درجہ رکھتا ہے۔''

''جاوید نامہ'' میں روحانی سیر کرتے ہوئے جب اقبال منصور حلاج سے ملتے ہیں تو اُن کی زبانی ایسے خوبصورت اور لازوال بلکہ الہامی اشعار کہتے ہیں کہ ایک عشقِ رسول ﷺ میں غلطاں غُلامِ رسول ﷺ ہی یہ کلام کہہ سکتا ہے۔

ہر کُجا بینی جہانِ رنگ و بُو
آں کہ از خاکش بروید آرزو
یا زنورِ مصطفیٰ ﷺ اُو را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ ﷺ است (۵)

۱۹۳۱ء میں اقبال لندن میں ہونے والی دوسری گول میز کانفرنس کے لیے بحری جہاز میں یورپ روانہ ہوئے۔ عدن کی بندرگاہ پر ساحلِ عرب کو دیکھ کر آپ پر عجیب و غریب جذباتی کیفیت طاری ہوگئی اور سرزمینِ عرب کو مخاطب کرتے ہوئے یوں گویا ہوئے:

''اے عرب کی مُقدس سرزمین' تجھ کو مُبارک ہو۔ تُو ایک پتّھر تھی جس کو دُنیا کے معماروں نے رَدّ کر دیا تھا' مگر ایک یتیم بچّے نے خدا جانے تجھ پر کیا افسوں پھونک دیا کہ موجودہ دُنیا کے تہذیب و تمدن کی بُنیاد تجھ پر رکھی گئی ..... کاش میں تیرے صحراؤں میں لُٹ جاؤں اور دُنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پروانہ کرتا ہوا اِس پاک سرزمین میں جا سکوں' جس کی گلیوں میں اذانِ بلالؓ کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی۔''

لوح بھی تُو' قلم بھی تُو' تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

(ذوق و شوق' بالِ جبریل) (۶)

علّامہ اقبال کی زندگی درحقیقت مختلف کیفیات کی آئینہ دار تھی' لیکن جس کیفیت کو ثبات و دوام حاصل تھا وہ ''عشقِ مصطفیٰ ﷺ'' کی کیفیت تھی۔ انہیں رسالت مآب ﷺ سے عشق تھا اور یہ عشق مختلف صورتوں اور پہلوؤں کے ساتھ نمایاں ہوا کرتا تھا۔ یہ عشق خوددار بھی تھا' غیور بھی تھا' اس میں نیاز بھی تھا اور نیائش بھی' اس میں درد بھی تھا اور سوز بھی' اس میں گُداز بھی تھا' اس میں رفعت بھی تھی اور سپردگی بھی' اور یہی سپردگی اس عشق کی جان تھی۔

یہی کیفیت ہے جسے اقبالؒ نے اپنے ایک شعر میں بیان کر دیا ہے۔

خواجۂ مَن! نگاہ دار آبروئے گدائے خویش
آنکہ ز جوئے دیگراں پُر نکند پیالہ را (۶)

(زبورِ عجم) (۷)

اقبال' اسلام اور اس کے پیغام کے بارے میں نہایت راسخ الایمان تھے اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اُن کی محبّت' شغف اور اُن کا اخلاص انتہا درجے کا تھا۔ اس لیے اُن کے نزدیک اسلام ہی ایک ایسا زندۂ جاوید دین ہے کہ اس کے بغیر انسانیت فلاح و سعادت کے بامِ عروج تک پہنچ ہی نہیں سکتی۔ اور نبی اکرم ﷺ رُشد و ہدایت کے آخری مینار' نبوت و رسالت کے خاتم اور مولائے کُل ہیں۔

وہ دانائے سُبل' ختم الرسُل' مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل، وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰ

(غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حُسن و زیبائی سے محرومی، بالِ جبریل) (۶)

ڈاکٹر اقبال صاحب ایک حکیم اور فلسفی تھے، جبکہ اکثر فلسفی مذہب سے زیادہ عقل کو ترجیح دیتے ہیں۔ خاص طور پر اکثر فلسفیوں کو مُعجزات کا مُنکر پایا گیا ہے، لیکن علّامہ اقبالؒ عاشقِ مصطفیٰ ﷺ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ احادیثِ رسول ﷺ میں بیان کیے گئے رسول اکرم ﷺ کے ہر معجزے پر اُن کو ایقان تھا۔ چُنانچہ سیّد نذیر نیازی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''ایک دن مجھ سے حدیثِ رسول ﷺ پر گفتگو فرما رہے تھے، جب حضرت ابوسعید خُدری رضی اللہ عنہ کی اس روایت کا ذکر آیا کہ حضور رسالت مآب ﷺ اپنے اصحابؓ کے ساتھ اُحد پر تشریف لے گئے اور اُحد کانپ اُٹھا تو حضرت علّامہ کہنے لگے: ''یہ محض استعارہ نہیں''۔ اور پھر درد کی تکلیف کے باوجود سیدھے ہو کر بیٹھ گئے، اور ایک ایک لفظ پر زور دیتے رہے، یاد رکھو یہ محض استعارہ نہیں!''

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس واقعہ کو نہایت مؤثر طریقے پر بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مُبارک کے ساتھ اُن کی والہانہ عقیدت کا حال اکثر لوگوں کو معلوم ہوگا، مگر شاید کسی کو نہیں معلوم کہ انھوں نے اپنے سارے فلسفے اور اپنی تمام عقلیت کو رسولِ عربی ﷺ کے قدموں میں ایک متاعِ حقیر کی طرح نذر کر کے رکھ دیا تھا۔'' (۶)

علّامہ اقبال عشقِ نبی ﷺ کی قوت کو محض اپنی کیفیات اور جذبات تک ہی محدود نہیں رکھتے، بلکہ یہ اُن کا اعجاز ہے کہ وہ اس عشقِ مصطفیٰ ﷺ کو اُمّتِ مصطفیٰ ﷺ میں منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ کتاب ''فیضانِ اقبال'' از شورش کاشمیری میں ہے کہ اقبالؒ نے فرمایا:

''مسلمانوں کا فرض ہے کہ اُسوۂ رسول ﷺ کو مدِّنظر رکھیں تا کہ جذبۂ عمل قائم رہے۔''

(تقریر میلاد النبی ﷺ)

اسی طرح قیامِ مصر کے دوران مصری نوجوانوں کی تنظیم ''شُبّانِ مصر'' کے نام پیغام میں لکھا کہ:

''مصر کے نوجوانوں سے میری درخواست ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے وفادار رہیں۔'' (۶)

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمد ﷺ سے اُجالا کر دے!

(جوابِ شکوہ، بانگِ درا)

اقبالؒ کے نزدیک اُمّت کی وحدت اور بقاء کا واحد حل ''عشقِ مصطفیٰ ﷺ'' ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان اپنے نبی ﷺ کے نام پر متحد ہو کر ایک ملّت بن جائیں۔

بُتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملّت میں گُم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

(طلوعِ اسلام، بانگِ درا)

پوری مسلم اُمہ کا ہر فرد، چاہے اُس کا تعلق کسی بھی جماعت، گروہ، مسلک یا سلسلے سے ہو، اُس کی وفاداریوں، وابستگیوں اور تعلقات کا محور اور مرکز حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی ہونی چاہیے۔

رموزِ بے خودی (رکن دوم رسالت) میں اقبالؒ فرماتے ہیں کہ:

از رسالت در جہاں تکوینِ ما
از رسالت دین ما آئینِ ما
از رسالت صد ہزارِ ما یک است
جزوِ ما از جزوِ ما لاینفک است (۷)
لَانَبِیَّ بَعْدِیْ ز احسانِ خُدا است
پردۂ ناموسِ دینِ مصطفیٰ است
قوم را سرمایۂ قوت ازو
حفظِ سِرِّ وحدتِ ملّت ازو (۸) (۶)

میر غُلام بھیک نیرنگ لکھتے ہیں کہ:

''نبی ﷺ کا عشق اقبالؒ پر ایسا طاری تھا کہ اگر آپ کو مدینہ منورہ کی زیارت کا موقع مل جاتا تو شاید آپ وہاں سے زندہ واپس نہ آتے۔'' (۶)

لاہور میں جب ایک نوجوان علم دین نے گستاخِ رسول ﷺ ہندو راج پال کو جہنّم واصل کیا تو اُسے سزائے موت ہوگئی۔ لاکھوں مسلمانوں کے بیچ سیّد دیدار علی شاہؒ کے ساتھ علّامہ اقبالؒ بھی اُن خوش نصیب ہستیوں میں شامل تھے جنھوں نے غازی علم دین کو لحد میں اُتارا۔

علّامہ اقبالؒ نے غازی علم دین کی قبر پر مٹّی ڈالتے ہوئے رُندھی ہوئی آواز میں یہ تاریخی جملہ کہا کہ: ''ہم تو باتیں ہی کرتے رہ گئے اور ترکھان (بڑھئی) کا بیٹا بازی لے گیا۔''

گردِ تو گردد حریمِ کائنات
از تو خواہم یک نگاہِ التفات(۹)

(درحضورِ رسالت ﷺ، پس چہ باید کرد)(ڈ)

کتاب ''تذکرۂ اقبالؒ'' از پروفیسر سعید راشد (علیگ) میں ہے کہ:

''اقبال اکثر یہ سوچ کر مضطرب اور پریشان ہوجاتے کہ کہیں اُن کی عُمر اُن کے پیارے نبی مصطفیٰ کریم ﷺ کی عُمر سے زیادہ نہ ہوجائے۔''

آخر کار اقبالؒ کی یہ تمنّا پوری ہوئی اور اقبال اکسٹھ برس کی عمر میں خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ؎

می ندانی عشق و مستی از کُجاست؟
ایں شعاعِ آفتابِ مصطفیٰ ست!(۱۰)

(روحِ حکیم سنائی از بہشتِ بریں جواب می دہد، مثنوی مُسافر)

اقبالؒ شاعر تھے، فلسفی تھے، وکیل تھے، ادیب تھے، حکیم الاُمت تھے، دانائے راز تھے، زندہ رود تھے، مُفکّر تھے، مُدبّر تھے، پاکستان کے مصوّر اور بقول ڈاکٹر اسرار احمدؒ پاکستان کے مُبشّر اور قافلۂ ملّی کے حُدی خواں تھے، رومیٔ ثانی تھے، شاعرِ مشرق تھے، شاعرِ اسلام تھے۔ لیکن ان سب حیثیتوں پر بالا اُن کی یہ حیثیت تھی کہ وہ ''عاشقِ رسول ﷺ'' تھے۔ اُن کے نُطق و کلام کا مرکز، اُن کی زندگی کا مقصد، اُن کے پیام کا محور، اُن کی دعوت کا منشا صرف ''حُبِّ مصطفیٰ ﷺ'' تھا۔ علّامہ اقبال حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی سیرتِ پاک کا غائر مُطالعہ کرنے اور مطالبِ قُرآنی پر عبور حاصل کرنے کے بعد، اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ آقائے نامدار حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذاتِ بابرکات تمام کمالاتِ ظاہر و باطن کی جامع اور جملہ حقیقت و مجاز کا سرچشمہ ہے۔ اقبالؒ کی شاعری، پیام، دعوت اور حیات کا اگر ایک شعر میں خُلاصہ بیان کرنا مقصود ہو تو یہ شعر اس کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔ ؎

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است(۱۱)

(ارمغانِ حجاز)

اردو ترجمہ و مفہومِ اشعارِ فارسی

۱) ''جس کسی کو نبی اکرم ﷺ کے ساتھ محبّت کی دولت حاصل ہے گویا دُنیا کا کُل خشک و

تر اُس کے دامن کے ایک گوشے میں موجود ہے۔''

۲) ''اے اللہ! تُو دونوں جہانوں سے بے نیاز ہے اور میں ایک سائل و فقیر ہوں۔ روزِ قیامت میری بے شُمار معذرتوں کو قبول فرماتے ہوئے مجھے مُعاف کر دینا، لیکن اگر میری معذرتوں کے باوجود میرا حساب لینا لازمی ہو جائے تو پھر میرے رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی نگاہوں سے بچا کر میرا حساب لینا۔''

۳) ''وہ مسلمان جو فقیری میں بھی بادشاہ تھا، یعنی فقیری میں اللہ کے سِوا ہر ایک سے بے نیاز تھا، اُس کے سینے سے آہ (دینِ اسلام کی محبّت) کا سوز مٹ گیا ہے۔
اُس کا دل آہ و فریاد کر رہا ہے، وہ نہیں جانتا کہ (اُس کا دل) کیوں آہ و فریاد کر رہا ہے۔
اے رسول اللہ ﷺ! ایک نگاہِ کرم کر کے اس کی تقدیر بدل دیجیے۔''

۴) ''محمد مصطفیٰ ﷺ کا مقام مسلمان کے دل میں ہے۔ ہماری عزّت اور آبرو مصطفیٰ ﷺ کے نام مُبارک سے ہے۔''

۵) ''اس جہانِ رنگ و بو کی خاک سے آرزو ــــ عشق، تعمیر، تخلیق، قوتِ حیات، زندگی ــــ کا جو بھی شرارہ پھوٹتا ہے، اُس کی رونق اور تابندگی یا تو نورِ مصطفیٰ ﷺ کا کرشمہ ہے اور اگر اس میں کچھ کمی ہے تو سمجھ لو وہ ہنوز مصطفیٰ ﷺ کی تلاش میں سرگرداں ہے۔''

۶) ''میرے خواجہ ﷺ! اپنے گدا کی آبرو کا خیال رکھ لیجیے۔ اسے اپنے لُطف سے نواز دیجیے۔ آپ ﷺ کا یہ گدا اتنا خود دار ہے کہ اس کے سامنے دوسروں کی ندّیاں موجود تھیں مگر اُس نے ان سے اپنا کاسۂ گدائی نہ بھرا۔''

۷) ''ہمارا وجود اِس دنیا میں رسالت سے ہے۔ رسالت ہی سے ہمیں دین ملا، رسالت ہی سے شریعت ملی۔ رسالت ہی کی برکت ہے کہ ہم کروڑوں کی تعداد میں ہونے کے باوجود ایک ہیں۔ ہمارا ایک جزو دوسرے جزو سے اس طرح جُڑا ہوا ہے کہ اسے کبھی الگ نہیں کیا جا سکتا۔''

۸) ''رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''میرے بعد کوئی نبی نہیں''۔ یہ خُدا کا احسان ہے اور یہ دینِ مصطفیٰ ﷺ کے ناموس کا پردہ ہے۔ قوم کو قوت ملتی ہے تو رسول ﷺ ہی سے ملتی ہے اور ملّت کی وحدت کا راز بھی اُسی پاک ذات ﷺ کی بدولت ہے۔''

۹) ''اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! پوری کائنات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گرد گھوم رہی ہے۔ میں (بھی) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک نگاہِ التفات کی التجا کرتا ہوں۔''

۱۰) ''کیا تُو نہیں جانتا کہ عشق و مستی کہاں سے حاصل ہوتی ہے؟ یہ (عشق و مستی) حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آفتاب کی شعاع ہے۔''

۱۱) ''خود کو درِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچا کر دم لو۔ اس لیے کہ اگر تُم اس مقام تک نہ پہنچ سکے تو سمجھ لو کہ پھر بولہبی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ آئے گا!''

کتاب: کُلّیاتِ اقبالؒ (فارسی) از پروفیسر حمید اللہ شاہ ہاشمی

حوالہ و حواشی (کتب)

ا: سید سلیمان ندویؒ کے مضمون ''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق'' میں بھی اس حدیث کا تذکرہ ہے۔

ب: معاصر تہذیبی کشمکش اور فکرِ اقبالؒ.....اسباب، اثرات اور حل، از ڈاکٹر طاہر حمید تنولی۔

ت: اے آر وائی، کیو ٹی وی پروگرام ''اقبالؒ اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' قسط نمبر ۷۔

ث: کتاب ''کلمات'' از ڈاکٹر صاحبزادہ ساجد الرحمٰن۔

ج: کتاب ''زندہ رود'' از جاوید اقبال۔

ح: کتاب ''اقبالؒ اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' از سید رئیس احمد جعفری ندوی۔

خ: کتاب ''نقوشِ اقبال'' مضمون: ''اقبالؒ کی شخصیت کے تخلیقی عناصر'' از مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ۔

د: کتاب ''اقبالِ کامل'' از عبدالسلام ندوی۔

ذ: کتاب ''پیامِ اقبالؒ بنام نوجوانانِ ملّت'' از سید قاسم محمود۔

ر: ''تصوّف اور اقبالیات'' از ڈاکٹر طاہر حمید تنولی۔

ز: کتاب ''علّامہ اقبالؒ کی تابندہ یادیں'' از ڈاکٹر ندیم شفیق ملک۔

ژ: کتاب ''تحریکِ پاکستان کے فکری محرکات'' از سید فضل الرحمٰن۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت، آپؐ کے مقصدِ بعثت، اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قرآنی تصور، سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف گوشوں، خاص طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے انقلابی پہلو جیسے علمی و عملی موضوعات پر 9 کتابوں کا مجموعہ

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ہم

از ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ

516 صفحات پر مشتمل فکر انگیز تالیف

اشاعت خاص (مجلد):
امپورٹڈ آفسٹ پیپر، قیمت: 450 روپے

اشاعت عام (پیپر بیک):
امپورٹڈ بک پیپر، قیمت: 300 روپے

خود پڑھیں۔ دوسروں کو تحفہ میں دیجیے!

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور فون: 3-35869501-042

maktaba@tanzeem.org

خدمتِ خلق اور سیرتُ النّبی ﷺ

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

مخلوقِ خدا کی خدمت کرنا بڑی عزیمت کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات میں سے انسان کو اشرف بنایا اور انسانوں میں رسول اللہ ﷺ کا درجہ سب سے بلند کیا۔ یوں آپؐ پوری کائنات کے سردار ٹھہرے۔ آپ ﷺ کی ذات میں تمام ممکن اخلاقی خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو رحمۃٌ للعالمین کا خطاب دیا۔ فرمایا: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾﴾ (الانبیاء) ''اور ہم نے آپؐ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کے بھیجا ہے۔''

خدمتِ خلق کا مطلب یہ ہے کہ مخلوقِ خدا کی خدمت کی جائے اور اس کے لیے کسی اجر یا معاوضے کی توقع نہ رکھی جائے۔ چونکہ آپ ﷺ محبوبِ خدا تھے' لہٰذا خدا کی مخلوقات کے ساتھ بھلائی کرنا ہی آپؐ کا مشن تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

((اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ' فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عِيَالِهٖ))

(رواه البيهقى فى شعب الايمان)

''تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے' پس مخلوق میں سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ترین وہ شخص ہے جو اُس کے کنبے کے ساتھ بھلائی کرے۔''

چنانچہ آپ ﷺ کی سیرت شاہد ہے کہ آپؐ نے نہ صرف انسانوں بلکہ مخلوق کی ہر صنف کے ساتھ بھلائی کی ہے۔ ہاں سب سے بڑھ کر آپ ﷺ نے انسانیت کی خدمت کی اور اس بے غرض خدمت کے بدلے میں آپؐ نے ہر طرح کی تکلیف واذیت برداشت کی۔

انسانوں کی سب سے بڑی خدمت اور بھلائی یہ ہے کہ انہیں صراطِ مستقیم پر چلنے کے لیے راہ نمائی دی جائے تاکہ وہ آنے والی زندگی کے لیے تیار ہو جائیں' وہاں ابدی راحت اور چین پائیں اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی' غضب اور عذاب سے بچ جائیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے

انسانوں کو خالق کائنات سے متعارف کرایا اور اُس کا پیغام نوعِ انسانی تک پہنچا دیا۔ آپ ﷺ نے اس کام میں پوری زندگی گزار دی۔ جن خوش نصیبوں نے آپ ﷺ کی تعلیم کو اپنایا انہوں نے اپنی عاقبت سنوار لی اور جن لوگوں نے آپ ﷺ کی بات نہ مانی بلکہ آپؐ کو ہر طرح سے تنگ کرتے رہے وہ ناقابلِ تلافی نقصان میں رہے۔ جب دنیا میں کیے گئے اعمالِ بد کے نتیجے میں اللہ کے رسول ﷺ کے نافرمانوں کو جہنم میں ڈالا جائے گا تو وہ حسرت و افسوس سے کہیں گے: ﴿يٰلَيْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ﴿۶۶﴾﴾ (الاحزاب) ''اے کاش کہ ہم نے اللہ اور رسول کی بات مانی ہوتی!'' مگر اُس وقت کا پچھتاوا اُن کے کسی کام نہ آئے گا۔ پس آپ ﷺ کی رحمۃٌ للعالمینی کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ آپؐ نے انسانوں کو نجات کا راستہ دکھایا جس سے وہ ابدی راحت حاصل کریں گے۔ آج ہم جو مسلمان ہیں اور قیامت تک آنے والے مسلمان آپ ﷺ ہی کی سعی وکوشش کی وجہ سے مسلمان ہیں۔

آپ ﷺ نے اللہ کے پسندیدہ دین کو فروغ دیا' جب کہ دینِ اسلام کی تمام تعلیم کا مرکز ومحور اللہ کی توحید اور خدمتِ خلق ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ كَانَ فِىْ حَاجَةِ اَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِىْ حَاجَتِهٖ)) (صحيح مسلم)

''جو شخص اپنے کسی بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں لگا ہوا ہو اللہ تعالیٰ اُس کی ضرورت پوری کرتا ہے۔''

خدمتِ خلق کی فضیلت بیان کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ نے اس شخص کو لوگوں میں بہترین قرار دیا جو لوگوں کو سب سے زیادہ نفع پہنچانے والا ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((خَيْرُ النَّاسِ اَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ)) نیز فرمایا: ((اِرْحَمُوْا مَنْ فِى الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِى السَّمَاءِ)) (رواه ابوداؤد والترمذى) ''زمین والوں پر رحم کرو' آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔''

مولانا حالی نے اس حدیث کا ترجمہ اس طرح کیا ہے: ؎

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہو گا عرشِ بریں پر!

رسول اللہ ﷺ نے خدمتِ خلق کی تعلیم دی اور اپنی سیرت وکردار سے اس کی عملی صورت بھی پیش فرما دی۔ آپ ﷺ کی بعثت کے وقت غلامی کا رواج عام تھا۔ آپؐ نے طرح

طرح سے غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی۔ جس کسی کے پاس غلام تھے تو آپؐ نے تلقین فرمائی کہ ان سے مناسب محنت لی جائے' ان کو اپنے برابر بٹھایا جائے' کسی صورت ان کی تحقیر و تذلیل نہ کی جائے' بلکہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو خود کھاؤ وہی اپنے غلام کو کھلاؤ اور جو خود پہنو وہی اسے پہننے کو دو''۔ آپ ﷺ ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے۔ اگر کوئی سوالی آتا تو ہر صورت اُس کی ضرورت پوری فرماتے' اگر اپنے پاس کچھ نہ ہوتا تو قرض لے کر اس کی مدد کرتے۔

آپ ﷺ نے عدل و انصاف کی اعلیٰ مثال پیش کی۔ ایک اونچے خاندان کی عورت نے چوری کی۔ بعض لوگوں نے اس کی سفارش کرنا چاہی تاکہ اسے قطعِ ید کی سزا نہ دی جائے۔ آپ ﷺ نے اس پر شدید اظہارِ ناراضگی کیا اور فرمایا: ''تم اللہ کی حدود میں سے ایک حد کے بارے میں سفارش کرتے ہو؟'' اور پھر آپ ﷺ نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا اور فرمایا: ''تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان کو اسی چیز نے ہلاک کیا کہ ان میں سے کوئی صاحبِ حیثیت آدمی چوری کرتا تو اُس کو (سزا دیے بغیر) چھوڑ دیتے تھے اور اگر ان میں سے کوئی کمزور اور غریب آدمی چوری کرتا تو اسے سزا دیتے تھے۔ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی' اگر میری بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو مَیں اُس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔''

آپ ﷺ بے کسوں کی دست گیری کرتے' بیواؤں کی خبر گیری کرتے اور یتیموں پر شفقت فرماتے' معذوروں اور محتاجوں کے کام آتے اور ان کی ضروریات کا خیال رکھتے۔ یہ آپ ﷺ کے کردار کا نمایاں حصہ تھا۔ جب آپ ﷺ پر پہلی وحی نازل ہوئی تو یہ آپؐ کے لیے انوکھا معاملہ تھا۔ آپؐ نے اس کا اظہار بی بی خدیجہ ؓ سے کیا تو انہوں نے آپؐ کو ان الفاظ کے ساتھ تسلی دی کہ آپؐ غریبوں اور ضرورت مندوں کے کام آتے ہیں' بیواؤں اور یتیموں کی مدد کرتے ہیں' اللہ تعالیٰ آپؐ کو ضائع نہیں کرے گا۔

آپ ﷺ نے ہمسایوں کے ساتھ اچھے سلوک کی تلقین کی اور فرمایا: ''جس شخص نے سیر ہو کر کھایا اور اس کا ہمسایہ بھوکا سویا جبکہ وہ جانتا تھا تو ایسا شخص ہم میں سے نہیں''۔ ہمسائے کے آرام و آسائش کا ہر طرح سے خیال رکھنے کی تلقین فرمائی۔ اپنی دیوار کو بلند کرنے سے روکا جس سے ہمسائے کو تکلیف ہو۔ ہمسائے کے گھر جھانکنے سے بہت سختی سے روکا۔ ہمسائے کے حقوق پر

اس قدر زور دیا کہ بقول صحابہؓ ایسا معلوم ہونے لگا کہ ہمسائے کو وراثت میں حصہ دار ٹھہرا دیا جائے گا۔ یہ حدیث تو معروف ہے کہ ((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ)) (متفق علیہ) ''مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔''

آپ ﷺ نے ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کا بھائی قرار دیا اور فرمایا جو تم اپنے لیے پسند کرو دوسرے مسلمان بھائی کے لیے بھی وہی پسند کرو۔ پیاسے کو پانی پلانے اور بھوکے کو کھانا کھلانے کو اعلیٰ درجے کی نیکی قرار دیا۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ آپ ﷺ نے خود بھوکے رہ کر وقت گزار لیا اور بھوکے سوالی کو اپنا کھانا کھلا دیا۔ آپ ﷺ کے اتباع میں صحابہ کرام ؓ کی سیرت میں بھی یہ تمام اوصاف پائے جاتے ہیں۔ ان ہی کے ذکر میں قرآن مجید میں یہ الفاظ آئے کہ: ﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ﴾ (الحشر:۹) ''وہ دوسروں کو خود پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ خود کتنے ہی ضرورت مند ہوں۔''

خدمت کے اوّلین مستحق ماں باپ ہیں۔ قرآن مجید میں کئی مقامات پر جہاں شرک سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے وہاں ساتھ ہی والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا: ﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـــًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ (النساء:۳۶) ''اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور والدین کے ساتھ بھلائی کرو''۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ:

﴿اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝۲۳ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝۲۴﴾ (بنی اسرائیل)

''اگر یہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک تمہارے پاس بڑھاپے کو پہنچ جائے تو ان کو اُف بھی نہ کہو اور نہ ہی ان کو جھڑکو بلکہ ان کے ساتھ نرمی سے بات کرو' اور اُن کے سامنے اپنے بازو جھکائے رکھو عاجزی اور نیاز مندی سے' اور دعا کرتے رہو: اے میرے پروردگار! تو ان دونوں پر رحم فرما جس طرح انہوں نے مجھے بچپن میں پالا۔''

ایک صاحب نے عرض کیا: یارسول اللہ! اولاد پر ماں باپ کا کیا حق ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((هُمَا جَنَّتُكَ وَنَارُكَ)) (سنن ابن ماجه) ''وہ تمہاری جنّت بھی ہیں اور جہنّم

بھی''۔ یعنی ان سے حسنِ سلوک کر کے تم جنّت کے مستحق بن سکتے ہو اور ان کے حقوق سے اعراض تمہیں جہنّم کا ایندھن بنا سکتا ہے۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا: ''باپ کی خوشنودی میں اللہ کی خوشنودی ہے اور باپ کی ناراضگی میں اللہ کی ناراضگی ہے''۔ اور فرمایا: ''ماں کے قدموں کے نیچے جنّت ہے۔''

ماں باپ کے ساتھ احسان کرنا اس قدر ضروری ہے کہ ماں باپ غیر مسلم ہوں تو بھی اُن کی ضروریات پوری کرنا اور ان کا ادب و احترام کرنا ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے والد تو آپؐ کی پیدائش سے پہلے ہی فوت ہو چکے تھے۔ ابھی آپؐ چھ سال کے تھے کہ والدہ بھی فوت ہو گئیں۔ آپ ﷺ کی رضاعی ماں حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ آپؐ ان کا حد درجہ احترام کرتے۔ اسی طرح آپ ﷺ کی رضاعی بہن شیما رضی اللہ عنہا آپؐ کے پاس آئی تو آپؐ نے ان کے بیٹھنے کے لیے اپنی چادر بچھا دی۔ ایک بار آپ ﷺ کی رضاعی خالہ آپؐ کے پاس آئی۔ آپؐ کے دریافت کرنے پر اُس نے آپؐ کو بتایا کہ اماں حلیمہ فوت ہو چکی ہیں۔ آپ ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے' پھر آپؐ نے اسے لباس' سواری کا جانور اور دو سو درہم نقد دے کر رخصت فرمایا۔

نبی اکرم ﷺ رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تلقین فرماتے۔ رحمی رشتہ داروں کے ساتھ خصوصاً اچھے تعلقات کا حکم دیتے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ ''رحمی رشتہ توڑنے والا جنّت میں نہیں جائے گا''۔ یہ رشتے اللہ تعالیٰ نے بنائے ہیں تو اللہ کے بنائے ہوئے رشتوں کو توڑنا اللہ تعالیٰ کے فیصلے کو نہ ماننا ہے۔ اس لیے اس کی اتنی سخت سزا ہے۔ رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم یہاں تک ہے کہ اگر وہ غیر مسلم ہوں تو بھی ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیے اور ضرورت مند ہوں تو ان کی ضرورت پوری کرنا چاہیے۔

عرب میں یتیموں اور بیواؤں کا کوئی پُرسانِ حال نہ تھا۔ رسولِ مکرم ﷺ نے ان کے حقوق متعین فرمائے اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کو اعلیٰ درجے کی نیکی قرار دیا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَ سَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا ۝۱۰﴾ (النساء) ''یقیناً وہ لوگ جو یتیموں کا مال ہڑپ کرتے ہیں ناحق وہ تو اپنے پیٹوں میں آگ ہی بھر رہے ہیں۔ اور وہ عنقریب بھڑکتی آگ میں داخل ہوں گے''۔

اس کے برعکس آپ ﷺ نے یتیموں کی کفالت کرنے والوں کو جنّت میں اپنی معیت کی نوید سنائی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مَیں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنّت میں یوں ہوں گے جیسے یہ دو انگلیاں قریب قریب ہیں''۔ ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''سب سے اچھا گھر وہ ہے جس میں یتیم کے ساتھ بھلائی کی جا رہی ہو اور سب سے بُرا گھر وہ ہے جس میں یتیم کے ساتھ بدسلوکی کی جاتی ہو''۔ آپ ﷺ نے بیواؤں کی کسمپرسی کا ازالہ فرمایا' انہیں وراثت کا حق دار قرار دیا اور دوبارہ نکاح کی حوصلہ افزائی کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''بیوہ اور غریب کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے اور اُس شخص کے برابر ہے جو دن بھر روزہ رکھتا ہے اور رات بھر نماز پڑھتا ہے۔''

مخلوقات میں انسان تو حسنِ سلوک کے اوّلین مستحق ہیں' مگر آپ ﷺ نے دوسرے جانداروں کو بھی نظر انداز نہیں کیا' بلکہ حیوانات' چرند' پرند اور کیڑے مکوڑوں کو بھی ستانے سے منع فرمایا اور ان کے ساتھ ہمدردی اور بھلائی کی تعلیم دی۔ جانوروں کو بھوکا رکھنے' کم خوراک دینے اور زیادہ کام لینے سے آپ ﷺ نے روکا۔ پالتو جانوروں کے ساتھ آپ ﷺ نے اچھے سلوک کی تعلیم دی۔ ان کے آرام کا خیال رکھنے اور ان کو بہتر اور وافر خوراک دینے کا حکم دیا۔ آپ ﷺ نے ایک فاحشہ عورت کے متعلق فرمایا کہ اُس نے ایک پیاسے کُتّے کو گہرے کنویں سے بدقتِ تمام پانی نکال کر پلایا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرما دی۔ ایک اونٹ آپ ﷺ کے سامنے بلبلایا' اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ آپ ﷺ نے اسے پیار سے تھپتھپایا اور پوچھا یہ کس کا اونٹ ہے؟ ایک صاحب نے کہا یہ میرا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ تم اس سے کام زیادہ لیتے ہو اور خوراک کم دیتے ہو۔''

آپ ﷺ کی تعلیم ہے کہ جس جانور کو ذبح کرنا ہو اُس کو کم از کم تکلیف دی جائے' چھری تیز ہو' تاکہ یکبارگی گلا کٹ جائے۔ جب تک جانور ٹھنڈا نہ ہو جائے اس کی کھال نہ کھینچی جائے۔ کسی زندہ جانور کے سامنے دوسرے جانور کو ذبح نہ کیا جائے۔

آپ ﷺ نے خدمتِ خلق کی تعلیم بھی دی اور اس کا عملی نمونہ بھی پیش کیا اور بتایا کہ انسان ہو یا حیوان' اس کے ساتھ بھلائی کرنا پسندیدہ بلکہ ضروری ہے۔

❁❁❁

Oct 2020
Vol.69

Regd. CPL No.115
No.10

Monthly **Meesaq** Lahore